خطاطی اور ہمارا رسم الخط

قلم

سیّد یوسف بخاری

خطاطی

اور

ہمارا رسم الخط

قلم

سید یوسف بخاری' دہلوی

نقش اول : مئی ۱۹۵۹ءمطابق شوال ۱۳۷۸ھ

ناشر : ایچ، ایم، سعید کمپنی، ناشران و تاجران کتب
پاکستان چوک، کراچی

طابع : ایجوکیشنل پریس، پاکستان چوک کراچی

مہتمم طباعت : محمد یعقوب، لکھنوی

حرف پرداز : (Compositer) مسلم اختر، (علیگ)

رسم الخط : اردو نستعلیق ٹائپ

صفحات : ۲۱۳ تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : مجلد چار روپے ۸ آنے - بلا جلد تین روپے -

4/50

ماخذ

۱ - فرہنگ آصفیہ : خانصاحب منشی سید احمد، دہلوی
۲ - محاکمۂ آردو : ایضاً
۳ - علم الحروف یا تحقیقات ماہر : حکیم محمود علی خاں، ماہر، دہلوی
۴ - اصطلاحات پیشہ وراں، جلد چہارم : مولوی ظفر الرحمان، دہلوی، مطبوعہ انجمن ترقیٔ آردو ہند، دہلی
۵ - خطبات اور مقالات گارساں د تاسی : مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو، ہند، دہلی
۶ - فن صحافت : مولوی رحم علی الہاشمی : مطبوعہ انجمن ترقیٔ آردو ہند، دہلی
۷ - افادی ادب : پروفیسر محمد اختر انصاری، علیگ
۸ - آئین اکبری : دارالترجمہ حیدرآباد، دکن
۹ - مضامین شرر : مولوی عبدالحلیم، شرر، لکھنوی
۱۰ - میری کہانی : پنڈت جواہر لعل نہرو
۱۱ - کمپنی کی حکومت : عبد الباری
۱۲ - دستور حکومت پاکستان
۱۳ - رپورٹ مردم شماری حکومت پاکستان، بابت ۱۹۵۱ء
۱۴ - رسائل و اخبارات : رسالہ آردو، جولائی، اکتوبر ۵۸ء قومی زبان، قومی آواز، انجمن ترقی اردو و ہند و پاک، نقوش لاہور، جنگ کراچی، منشور دہلی، تیج دہلی۔

نقوش

۱ ۔ فرمانِ مقدس حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم،
بنام سلطان مقوقس والیٔ مصر

۲ ۔ ورق قرآن مجید، نوشتہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ

۳ ۔ سرورق، منبہات : احمد بن محمد الحجی ۱۱۰۰ھ
(اس کتاب کے دنیا میں صرف تین قلمی نسخے موجود ہیں)

۴ ۔ وصلی دارا شکوہ

۵ ۔ وصلی میر عماد، عہد شاہ جہانی

۶ ۔ ورق قرآن مجید، عبدالباقی حداد، یاقوت رقم اول

۷ ۔ ورق قران مجید : قلم سید حامد بخاری ابن سید محمد شاہی
امام جامع مسجد، دھلی (۱۳۱۶ھ)

۸ ۔ ریشمی یافت میں خطاطی کا کمال

۹ ۔ شجرہ خطوط : مرتبہ مصنف

انتساب

ناخدایان خط کے نام

★

حرف ناشر

یوسف بخاری صاحب، دہلوی کی شخصیت، ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، خاندانی اعتبار سے بھی وہ خاندان آئمۂ جامع مسجد دہلی کے ایک ہونہار فرزند ہیں - ادبی خدمات کے علاوہ ۱۹۴۷ء تک قومی خدمات میں بھی پیش پیش رہے - انھیں داد کی تمنا ہے نہ صلہ کی خواہش اور نہ آرزوئے شہرت - ۱۹۳۰ء سے ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمات میں مصروف ہیں - کئی کتابوں کے مصنف ہیں - جن پر برصغیر ہند و پاک کے مشاہیر اہل قلم اپنے تبصروں میں انھیں زبان و ادب کی سندیں دے چکے ہیں، اس وقت بھی اُن کی متعدد کتب، بالخصوص "تاریخ جامع مسجد، دہلی اور "یادگار علائی" زیر تصنیف و طبع ہیں -

یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے کہ جب یوسف صاحب کو ان کی مشہور تصنیف "یہ دلی ہے" پر بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے میر امن کی زبان میں "دلی کا روڑا" خطاب عطا کیا تھا اور مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے فرمایا تھا کہ "میرے لئے تو یہ کتاب نعمت غیرمترقبہ ہے" ہم اُن سے پہلی بار متعارف ہوئے تھے -

خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی، یہ روڑا جو دلی کے پرانے آثاروں میں پڑا تھا جب اسے ۱۹۴۷ء کے خونچکاں انقلاب نے خاک میں ملانے کی کوشش کی تو در بدر کی ٹھوکریں

کھاتا، اس ارض پاک میں آگیا۔ گو حوادث نے اسے برباد کرتے کرتے کنکر بنا دیا ہے لیکن کنکر ہونے کے باوجود وہ اپنی سختی اور چمک دمک میں ایک ہیرا ہے۔ فلک کے جور اور زمانے کی ستم کوشی اب بھی اسے لہو رلاتی ہے مگر یہ صبر و وفا کا بندہ خود دار اور سخت جان ہے، موت کو زندگی اور زندگی کو موت سمجھتا ہے، مرنے کی آرزو میں روز مرتا ہے روز جیتا ہے، موت آتی ہے پر نہیں آتی، یوں، تڑپ کر کبھی چیخ اٹھتا ہے — "ہے کوئی نشتر فروش؟"

یہ مقالہ — "خطاطی اور ہمارا رسم الخط" بھی اس کی ایک دردناک اور دل‌دوز چیخ ہی ہے۔ "اردو کو بچاؤ، اردو کو اپناؤ" کوئی ہے؟ جو اس کی اس درد بھری چیخ کو سنے، اس کے قلب و جگر کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس دل فگار پکار پر دھیان دے۔ یہ فریاد گو نحیف اور کمزور ہے مگر بڑی پر سوز اور موثر۔

اردو کے ایک ادنیٰ ناشر اور معلن ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض تھا کہ ہم اسے آپ تک پہنچائیں۔ گل و بلبل کے نالے، زلف و سنبل کے افسانے، عشق و محبت کی حکایتیں، ناول اور ڈرامے ایک مدت سے سنتے آرہے ہیں، کب تک سنیں کہاں تک سنیں؟ وقت کا تقاضا ہے، وطن کا مطالبہ ہے، ملت کی آرزو ہے کہ اول شمشیر و سناں ہو اور طاؤس و رباب آخر — اردو ہماری شمشیر ہے، اردو ہمارا رباب ہے، بج رہا ہے گو بے آواز ہے۔

محمد ذکی

۲ - مئی ۱۹۵۹ء

حرف راقم

یہ مقالہ پہلے صرف خطاطی کی تاریخ اور مختصر تذکرہ خطاطان پر مشتمل تھا - موضوع کے اعتبار سے چونکہ ذرا طویل مضمون تھا اس لئے "ماہ نو" کراچی کی تین اقساط میں شائع ہوا اور وہ بھی اختصار کے ساتھ - رسم الخط کا مسئلہ نا تمام اور باقی رہ گیا - اسی اثنا میں ۳۱ - دسمبر ۱۹۵۸ء کو موجودہ حکومت پاکستان کی جانب سے تعلیمی مسائل کی اصلاح و فروغ کے لئے ایک قومی تعلیمی کمیشن مقرر ہوا - اس کمیشن نے اپنے دائرہ کار کا اخبارات میں اعلان کیا - کمیشن کے دائرہ کار میں رسم الخط کا سوال بھی شامل تھا - اس ضمن میں عوام کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لئے ۷ - فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخ بھی مقرر کردی گئی تھی اور ہر مکتب خیال سے رسم الخط کے متعلق تجاویز اور آرا طلب کی گئی تھیں تا کہ ان کی روشنی میں کمیشن یہ فیصلہ کرے کہ آیا اردو زبان کو "رومن" رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے یا نہیں اور پاکستان میں اس کے رائج اور مقبول ہونے کے کہاں تک امکانات ہیں -

کمیشن کا یہ اعلان پڑھکر ہم ایک ذہنی انتشار میں مبتلا ہوگئے - جی میں آیا کہ مطبوعہ مضمون "خطاطی"

میں ”رسم الخط“ کے موضوع کا اضافہ کرکے کمیشن کو بھیجدیں اور اس طرح اپنا اظہار خیال ہو جائے ۔ ہم ابھی اسی فکر میں تھے کہ اچانک ادارہٴ ”جنگ“ کراچی اس مہم میں کود پڑا ۔ ”جنگ“ کا یہ اقدام نہایت موزوں اور بر محل تھا اور اس کے لئے وہ یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے ۔ جوں ہی ”جنگ“ نے اس مہم کا آغاز کیا ، میدان علم میں زبانِ خلق کے نقارے پر نیزہٴ خطی کی چوب پڑنے لگی ۔ ”اردو“ لشکر کے مجاہدین اور ”لاطینی“ جانباز ایک دوسرے کے مقابل آگئے ۔ ایک طرف پرچم آردو اور دوسری جانب رومن پھریرا لہرانے لگا ۔ یہ جنگ نصف ماہ تک جاری رہی ۔ دونوں فریقوں کے درمیان اہل زبان اور زبان داں ہر ایک کا قلم بے تکان چلا اور زبان و خط کے جوہر کھلے ۔ بالآخر اس استصواب رائے کا نتیجہ جو ۹۹ فیصدی اردو رسم الخط کے حق میں نکلا کمیشن کو بھیجدیا گیا ۔

اس موقعہ پر ہم نے مصلحتاً اپنی رائے محفوظ رکھی ، البتہ استصواب رائے کا نتیجہ برآمد ہونے تک اس جنگ کا بڑے غور سے عینی مشاہدہ کرتے رہے ۔ اس دوران میں جو مختلف دماغی کاوشیں ہمارے مطالعہ میں آئیں وہ چونکہ ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب خیال کی ترجمان تھیں اس لئے رسم الخط کے موافق اور مخالف تمام پہلو ہم پر روشن ہو گئے ساتھ ہی ساتھ ہمارے اس خیال کی بھی جلا ہو گئی کہ ایک زندہ قوم کہلانے کے لئے عوام میں احساس فرض اور قومی [illegible] کی جس قدر ضرورت ہے وہ بلا شبہ ایک بڑی حد تک [illegible]

پاکستانیوں میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۰ فیصد خواندگی میں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ الغرض اس التوائے عارضی سے ہمارا جو مقصد تھا وہ پورا ہوگیا، یعنی اب ہم اُن موافق اور مخالف آراء کی موجودگی میں قوم کے اس فیصلہ کو اپنے تبصرہ کے ساتھ ایک جامع صورت میں اپنی حکومت کے سامنے پیش کرسکتے ہیں، چنانچہ اسی نظریہ کے ماتحت ہم اپنے اس مقالہ کو ایک کتابی شکل دیکر اپنی حکومت اور ملت کی نذر کررہے ہیں۔

اس ضمن میں ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ تو ہم آئندہ سطور میں تحریر کر رہے ہیں۔ اس مقام پر حکومت اور ارباب حل وعقد کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کی یہ تحریک کوئی نیا اور عجوبہ شوشہ نہیں ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

انیسویں صدی سے اب تک بار بار سماعت میں آچکا ہے۔ جدوجہد آزادی ہی کے ضمن میں غیر منقسم ہندوستان میں "اُردو و ہندی زبان" اور "اُردو و دیوناگری رسم الخط" کا تنازعہ مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ یہ چپقلش یہاں تک بڑھی کہ متعلقہ و غیر متعلقہ سیکڑوں مسائل پیدا ہوگئے اور انجام کار اس کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔ با ایں همه وہاں آج بھی زبان اور رسم الخط کا سوال ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ بھارت کے مختلف صوبے لسانی بنیادوں پر اپنے علاقوں کی تقسیم کا برابر مطالبہ کررہے ہیں۔

جہاں تک ہمارے پاکستان کا تعلق ہے، ہمارا واسطہ اور رابطہ تقریباً دنیا کے تمام ممالک سے باالعموم اور اسلامی حکومتوں سے بالخصوص قائم ہے ۔ یہ دور حاضر سائینس اور ایجادات کا زمانہ ہے ۔ علوم و فنون کی کثرت اور شدت ہے بین الاقوامی سیاسی تقاضے، کاروباری اور معاشیاتی مصلحتیں ہیں ۔ صحافتی اور ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لئے فنی اور طباعتی دشواریاں ہیں ۔ ملکی تعلیمی مسائل اور دفتری نظام کی پیچیدگی ہے ۔ ہم نے دیدہ و دانستہ ابتک مذہب کا ذکر نہیں کیا، مبادا ہم پر بھی کٹ ملا یا دقیانوسی ہونے کا کوئی فتوئ صادر ہوجائے لیکن ظاہر ہے کہ ہم اپنے مذہب عزیز کو کسی بھی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھا سکتے ۔ رسول اکرم ص نے عالمگیر اسلامی قومیت کیلئے ہر چیز میں یکتائی اور انفرادیت پیدا کی ۔ قومیت کا یہی وہ احساس تھا جس نے ہمیں اول مسلمان اور بعد میں پاکستانی کے لقب سے ملقب کیا ۔

سر سید اعظم علیہ الرحمہ" کے بعد ارض پاک کے مفکر و شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال مرحوم اپنے دم آخر تک گیسوئے اردو کی مشام نوازی اور شانہ آرائی کرتے رہے پھر بھی ان کے خیال کے مطابق عروس اردو کی مانگ منت پذیر شانہ رہ گئی اور گیارہ طویل برس گذر جانے کے باوجود ہنوز منت پذیر شانہ ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عرصہ میں عاشقان زلیخائے اردو اس کی شانہ آرائی سے یکسر غافل رہے انھوں نے تو اپنی بساط کے مطابق غالباً اس سے بھی بڑھکر مشاطگی کی ۔ اس کی دلجوئی اور دلداری میں یہاں تک کیا کہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت،

ھندی ، بنگالی ، سندھی ، گجراتی اور پشتو وغیرہ جو آردو کی قدیم ھمجولی ، سہیلی ، بھنیلی اور منہ بولی بہنیں تھیں ان سب کو اس کے آس پاس رکھا ، انتہا تو یہ ھے کہ ” انگلش سسٹر “ کو بھی آس کے پہلو میں جگہ دی سب سے رشتے ناطے استوار اور تعلقات خوشگوار رکھے ۔

لگن یہ تھی کہ اس میل ملاپ کی فضا میں کوئی مبارک دن دیکھکر کسی سبھ گھڑی اس ھندی ، پاک خوبرو دلھن کا کسی عالمگیر ادب سے بیاہ رچائیں اور خوشیاں منائیں لیکن کیا کیا جائے قائد اعظم اور قائد ملت کی جنتی روحوں کے بعد عقد کی باگ ڈور آن خود غرض سیاسی قضات اور حاکمان وقت کے ھاتھوں میں آئی جو یکے بعد دیگرے ، پے درپے ، مسلسل اور پیہم اپنی زبردستی سے ھمارے سروں پر مسلط رھے ۔ آن کو اس عقد نیک کی نہ کوئی فکر تھی اور نہ کوئی خوشی ۔ روز، روز عید اور شب ، شب‌برات مناتے رھے ، ھم روتے اور جلتے رھے ع

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

وہ سب اپنے ھی تھے ، اس لئے ھم خاموش رھے ۔ ھمارا سر تسلیم خم رھا ، مزاج یار کو دیکھتے رھے ۔ بے نیازی حد سے گذر گئی ۔ بندہ پروروں سے حال دل کہتے کہتے اور ” کیا ! “ سنتے سنتے کلیجہ پک گیا ۔ آنھوں نے ھمیں عاشق سمجھا اور صحیح سمجھا ۔ عشق لیلیٰ آردو کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ناخنوں کی کاوش سے بھی ھم لذت محسوس کریں ۔ آخر

کہاں تک؟ تا کہاں دل خونابہ ٹپکانے لگے صبر "ایوب" کام آیا، آھیں کارگر اور نالے رسا ھوگئے۔

گذشتہ ماہ اسی کراچی میں پاکستانی ادیبوں کا کنونشن ھوا تھا، اس ماہ فروری میں رسم الخط پر استصواب رائے عمل میں آیا ھے، مایوسی کفر ھے، ھم ناآسید نہیں اور نہ کبھی ھوں گے، لیکن اب ھمیں یہ دیکھنا ھے کہ اس دور جمہوریت میں، اس آزادیٔ فکر و خیال کے ماحول میں، موجودہ عہد حکومت میں کیا ھوتا ھے۔ اور ارباب حل و عقد ھمیں کیا دیتے ھیں ــــــــ "ھمارے حقوق"!

سید یوسف بخاری

کراچی، ۱۰ - فروری ۱۹۵۹ء

خطاطی

مشہور عربی مقولہ ہے "الخط ریاض العلوم" اور "القلم سفیر العقل"۔ جعفر برمکی کا قول ہے کہ خط حکمت کا دھاگا ہے جس میں ناسفتہ موتی پروئے جاتے ہیں، شیخ شمس الدین الاکفانی کے الفاظ میں خط کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ صرف معانی و مفہوم ادا کرتے ہیں اور خط الفاظ کے حسن صوری کو پیش کرتا ہے۔

ان اقوال سے خط کی اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے، بلا شبہ اگر یہ فن لطیف ایجاد نہ ہوتا تو ہزاروں میل دور افتادہ لوگوں سے روحانی ملاقات کیونکر ہوتی۔ افسوس! خط کا ماخذ اسقدر تاریک ہے کہ یقین کے ساتھ یہ بتانا محال ہے کہ وہ کب ایجاد ہوا۔ فنون لطیفہ کا یہ موضوع جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر کٹھن بھی۔ گو یہ مختصر مقالہ اس دفتر عظیم کا متحمل نہیں ہوسکتا، تاہم تاریخ کی روشنی میں ہم ایک مختصر سا اجمالی خاکہ پیش کرکے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ خط کی پیدائش کے اسباب کیا تھے، وہ کیونکر وجود میں آیا اور پھر اپنے ارتقائی اور تدریجی منازل سے گذر موجودہ خطوط نسخ اور نستعلیق تک کس طرح پہنچا۔

تخلیق زبان: انسان کے عناصر ترکیبی، "آب، آتش، خاک اور باد" میں فوقیت اور برتری ھوا کو حاصل ھے، ھوا کو ھم با الفاظ دیگر سانس یا نفس کہتے ھیں، انسانی زندگی کا دار و مدار اسی سانس کی آمد و رفت پر ھے اور یہی اسکا نشان حیات ھے۔ اس سانس کو خدا نے مختلف آوازوں سے مکلف کیا ھے۔ چنانچہ پیدائش کے وقت بصورت گریہ "ھیاؤں، ھیاؤں" کی جو آواز نوزائیدہ بچے کے کام و دھن سے نکلتی ھے وہ اسکی سب سے پہلی اورقدرتی آواز ھے جسے ھم نطق یا گویائی کہتے ھیں۔ خدا نے یہ گویائی وحوش کو بھی عطا کی ھے، اُن کے منہ سے بھی پیدا ھوتے وقت مختلف قسم کی آوازیں نکلتی ھیں۔ انسان بذات خود ایک نوع حیوان ھے اور انسان اور حیوان دونوں ایک ھی قانون قدرت کے تابع ھیں۔ چنانچہ یہی وجہ ھے کہ انسان اور حیوان دونوں کی آوازوں میں کسی حد تک ایک فطری یگانگت اور ھم آھنگی پائی جاتی ھے۔

ھم دیکھتے ھیں کہ یوں تو ھمارا پالتو طوطا ھمارے پڑھائے اور رٹائے ھوئے الفاظ "مٹھو بیٹے، پاک ذات اور حق اللہ" نہایت صاف اور بے تکان ادا کرتا ھے لیکن جونہی وہ ھمارے پاؤں کے نیچے یا بلی کے چنگل میں آتا ھے تو یک لخت اپنا سبق بھول کر اپنی فطری آواز میں صرف "ٹیں" کرکے رہ جاتا ھے، اسی طرح بحالت خوف جب انسان اچانک چیختا ھے تو اس کے منہ سے لفظ "ھو" نکلتا ھے، اس کی یہ آواز سراسر حیوانی ھے۔ ان مثالوں سے ثابت ھوتا ھے کہ انسان کی زبان بھی ابتدا میں صرف اصوات کا مجموعہ تھی۔

الغرض انسان اور حیوان دونوں ابتدائے آفرینش سے ناطق اور گویا ہوتے ہیں کوئی گونگا نہیں ہوتا - ہم آن افراد کو بھی گونگا نہیں کہہ سکتے جو پیدائشی گونگے پیدا ہوتے ہیں - در اصل آن کے عضلات اور اعصاب کام و دھن پیدائشی نقص کے باعث صرف نطق سے محروم ہوتے ہیں آواز سے نہیں ، اس نظریہ کا اطلاق آن حیوانات پر بھی ہوتا ہے جو آواز سے تو محروم نہیں لیکن قوت گویائی نہیں رکھتے اور یہی وہ صفت اور جوہر ہے جو انسان کو حیوان سے افضل اور ممتاز کرتا ہے -

ابتدا میں انسان اور حیوانات کی یہ آوازیں بے ربط اور مہمل تھیں لیکن وقت اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہی آوازیں کانوں کی راہ سے دل و دماغ میں رستی اور بستی مختلف اشارات میں ڈھلتی گئیں ، ہر آواز ایک خاص مقصد کو واضح کرنے لگی ، بس اسی کا نام زبان ہے - ضرورت ہمیشہ سے ایجاد کی ماں اور عقل کارساز رہی ہے ، عقل کی رہنمائی میں مختلف اصوات کا یہ عطیہ (اشارات و سکنات) آہستہ آہستہ ایک مدت مدید میں حروف ، اور حروف سے با معنی اور مہمل الفاظ کے روپ میں سامنے آنے لگا - ابتدا میں یہ تمام الفاظ مفرد تھے جب انکی تعداد زیادہ ہوگئی تو مرکب الفاظ کی باری آئی ، آن کی بنیاد بھی انہی اصوات کی مرہون منت تھی -

محققین اور ماہرین السنہ کی یہ متفقہ رائے ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں ایک تہائی تعداد صرف آن حروف کی ہے جنکو اصوات کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا اور متعدد ایسے الفاظ ہیں

جنکی تشکیل مشابہت یا حرکات و سکنات ظاھری کی اساس پر صرف و نحو کے قواعد کے ماتحت عمل میں آئی ھے مثلاً

لفظ		آواز (۱)
سرسراھٹ	سے	۱ - ھوا کی سائیں سائیں
کھڑکھڑاھٹ	سے	۲ - خشک پتوں کی آواز
گھڑگھڑاھٹ	سے	۳ - چکی کی آواز
گرج	سے	۴ - بادل کی آواز
کڑک	سے	۵ - بجلی کی آواز
قائیں قائیں	سے	۶ - کوے کی آواز
جھیں جھیں	سے	۷ - جھینگر کی آواز
بھنبھناھٹ	سے	۸ - مکھی کی بھن بھن
چھم چھم	سے	۹ - پانی گرنیکی آواز

متعدد (۲) افعال ظاھری مشابہت اور ظاھری حرکات سے وضع ھوئے، مثلاً ''اجگر'' 'آج'، سنسکرت میں بکری کو کہتے ھیں اور 'گر' بمعنی نگلنا، اس مشابہت کی وجہ سے اجگر بنا یعنی بکریوں کو نگلنے والا اژدھا - ''کنکھجورا'' اس کا مادہ 'کن'، اور 'کھجور' ھے اس کیڑے کی جسمانی ساخت کھجور کے درخت سے مشابہ ھے اور فطرت یہ ھے کہ سوتے وقت کان میں گھس جاتا ھے -

جہاں تک انسانی آواز کا تعلق ھے، اس کا سرچشمہ کام و دھن ھے جو رباطات، عضلات، اعصاب اور عروق کا

---

۱ - ۲ - ملاحظہ ہو مقدمہ فرہنگ آصفیہ

مجموعہ ہے ۔ سانس کے ذریعے منہ سے ہزاروں قسم کی آوازیں نکلتی ھیں ، چونکہ قدرت نے ہر کام و دھن کی ھیئت اور ساخت جدا جدا رکھی ہے ، نیز آب و ھوا کے اختلاف سے بھی زبان متاثر ھوتی ہے لہذا اس بنیادی اور عالمگیر فرق کے باعث دنیا کے ہر فرد و بشر کا لب و لہجہ اور آواز کا زیر و بم بھی الگ الگ ہے ۔ جزوی مماثلت چنداں قابل لحاظ نہیں ، اس قدرتی نظام سے دنیا کی کوئی زبان مستثنیٰ نہیں ھوسکتی ۔

اس تشریح سے یہ ثابت ھوگیا کہ جس ھوا کا نام سانس ہے وھی حروف کا منبع و مخرج ہے ۔ جب سانس سے آوازوں کا ظہور ھوا تو ہر سانس میں تین قسم کی لہریں پائی گئیں ، موسیقی کی اصطلاح میں ان لہروں کو ''سر'' کہتے ھیں اور وہ سر آ ۔ ا اور آ ھیں ۔ ان تین سروں سے ہزاروں بول اور راگ جنم پاتے ھیں ۔ انہی لہروں کو زبان میں ''اعراب'' کہا جاتا ہے جو ا ۔ ی اور وٗ ھیں ۔ اھل عرب نے ان کو حروف علت قرار دیا ہے کیونکہ تمام حروف کا تانا بانا انہی کی نقل و حرکت اور گردش پر موقوف ہے ۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ تمام دنیا کی حروف ابجد کا پہلا حرف الف (ا) ہے ۔

ماحصل یہ کہ ابتدا میں اول اصوات و حرکات سے مفرد حروف (ابجد) اور مرکب الفاظ وضع ھوئے پھر کلمات بنائے گئے بعد ازاں ان میں حرف روابط اور ضمائر داخل ھوئے ، ادھر دھنی عضلات اور آب و ھوا کی بوقلمونی نے اس میں رنگا رنگی پیدا کی اور بالآخر مختلف ممالک میں مختلف اشکال اور تعداد میں حروف تہجی مقرر ھوئے اسطرح صدھا زبانیں وجود میں آئیں ۔

اہل ذوق چاہیں تو اس باب میں مستند لغات، تذکرہ و تواریخ السنۂ اقوام سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب غالباً — "امتحان الفضلاء" (تذکرۂ خطاطاں) ہے جسکو مرزا سنگلاخ نے ۱۲۹۱ ھ میں تہران سے شائع کیا۔ دوسرا تذکرہ "خط وخطاطان" مصنفہ حبیب آفندی ترکی زبان میں ہے، ۱۳۰۶ ھ میں قسطنطنیہ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں عراق و عجم کے ۳۴ خوش نویسوں کا ذکر ہے۔ تیسرا تذکرہ فرانسیسی زبان میں کلیمنٹ هوراٹ کا ہے جو ۱۹۰۸ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ چوتھا تذکرہ — مفتاح الخطوط — رضاؔ اللہ شاہ قادری ہندی کی تصنیف ہے لیکن اس میں ہند و پاکستان کے ارباب فن خط کا کوئی ذکر نہیں۔ پانچواں تذکرہ مولانا غلام محمد دہلوی کا ہے — یہ مختصر تاریخ خطاطی زبان فارسی میں ہے۔ اسے ۱۹۲۰ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ اس باب میں جن ماخذوں سے ہم نے کام لیا ہے ان میں بلا شبہ فرہنگ آصفیہ، اصطلاحات پیشہ وراں اور علم الحروف یا تحقیقات ماہر نہایت ہی مفید اور کار آمد نسخے ہیں۔ ہم نے ان تینوں کتابوں سے بالعموم اور تحقیقات ماہر سے بالخصوص کافی استفادہ کیا ہے، ہماری بیشتر معلومات تحقیقات ماہر کے اقتباسات اور تلخیص پر مشتمل ہیں۔

تاریخ السنۂ اقوام: آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ زبان سے کتابت یا خطاطی کا رشتہ کیونکر قائم ہوا۔ ابتدا میں انسان وحشی اور غیر متمدن تھا۔ ایک مدت دراز کے بعد

جب اُس نے انسانیت کے دائرے میں قدم رکھا اور متمدن ہوا تو اپنے مرکز سے دنیائے عریض و بسیط کے گوشوں میں جا بجا آباد ہو گیا، آپس میں ایک دوسرے کا حال دریافت کرنے کی فکر لاحق ہوئی نیز قومی اور ملکی حالات میں انقلابات پیش آئے تو اُن کو محفوظ رکھنا ضروری خیال کیا گیا ۔ ابتدا میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اظہار خیال کیلئے محض چند اشارات وضع ہوئے تھے، اشارات کے مقابلہ میں الفاظ کی تعداد زیادہ تھی، ظاہر ہے کہ تمام الفاظ کو دماغ میں محفوظ رکھنا ناممکن تھا ۔ حافظہ اور یادداشت کی اس خامی کیوجہ سے انھوں نے ابتدا میں چند نقوش اور تصاویر سے کام لیا ہر واقعہ اور مادی خیال کو تصویر کی صورت میں پیش کرنے لگے ۔ مثلاً ایک بادشاہ کو ایک شیر نے ہلاک کردیا ۔ چونکہ یہ ایک اہم واقعہ تھا اس لئے انھوں نے پتھر پر ایک تصویر بنائی کہ ایک شیر انسان سے لڑ رہا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ تھا خط کا وہ پہلا خاکہ جو دورِ صوری مادی کہلایا ۔

تحقیقات ماہر میں رسالہ الہلال مطبوعہ مصر (۱۹۳۳ء) کے حوالہ سے ایک مصور ٹھیکرے کا ذکر کیا گیا ہے جو شہر تیب جورا (مابین دجلہ و فرات) میں آثار قدیمہ سے برآمد ہوا تھا ۔ اس ٹھیکرے پر حضرت آدم و حوا کی وہ تصویر منقش ہے جسکا تعلق اُن کے اخراج جنت کے واقعہ سے ہے ۔ یہ تصویر ۳۷۰۰ ق م کی خیال کی جاتی ہے یہ تصویر ثابت کرتی ہے کہ انسان زمانۂ قدیم ہی سے دنیا کے مشہور واقعات قلمبند کرنے کے لئے کس درجہ بیقرار تھا ۔ مصر کے مورخوں کا خیال

ہے کہ حضرت ابراہیم کی ولادت — ۱۹۹۶ ق م سے دو ڈھائی ہزار برس قبل مصر میں ''خط تمثال'' جاری تھا ۔

پھر ایک زمانۂ دراز کے بعد تصاویر کی بجائے مخصوص اشارات سے کام لیا گیا ۔ مثلاً اظہار دشمنی کے لئے سانپ کا ایک کنڈل بنایا گیا ۔ آسمان ظاہر کرنے کیلئے نصف قوس کھینچی گئی ، دریائی سفر کے لئے کشتی کا خاکہ دکھایا گیا وغیرہ وغیرہ یہ دور صوری معنوی مشہور ہوا ۔

رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ جب حالات اور واقعات نے نت نئی کروٹیں بدلیں اور بڑے بڑے واقعات پیش آئے تو ان کو ہر بڑے واقعہ کی وضاحت کیلئے ایک کی بجائے کئی کئی تصاویر سے کام لینا پڑا ۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بڑا کٹھن اور دشوار تھا ۔ لہذا انہوں نے تصویر کشی کو خیر باد کہہ کر مختلف اجسام و اشکال پر مشتمل چند علامتیں (حروف ابجد) مقرر کیں ، اسطرح الف تا یائے تمام تحتانی حروف مرتب ہوئے ۔ اس ایجاد سے ایک تو اُن کو مصوری کی زحمت سے نجات ملی ، دوسرے اُن کی پہلی مصوری کے پرتو نے حروف کے قالب میں ایک نئی جان ڈال دی ۔ اس دور کو صوری حروف سے تعبیر کیا گیا اور یہی اقوام عالم کی کتابت کا سنگ بنیاد قرار پایا ۔

جب اس حد تک دسترس حاصل ہوگئی تو انہوں نے عقل و فراست کی رہنمائی میں حروف کو ترتیب دینا شروع کیا ، اس ترکیب سے لفظ اور الفاظ سے جملے بنانے شروع کئے ۔ یہ چوتھا حرفی دور تھا لیکن جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں کہ جب ماخذ بالکل تیرہ و تار ہو تو ٹھیک ٹھیک

بتانا محال ہے کہ ابجد کس زمانہ میں ایجاد ہوئی۔ تواریخ کی رو سے صحیح اندازہ اور سنین کا شمار زیادہ سے زیادہ طوفان نوح کے زمانہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور باقی تمام قیاسات ہیں۔ آئیے، اسی بنیاد پر ہم بھی تاریخ کی روشنی میں قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔

طوفان نوح سے چار ہزار برس قبل مسیح بابل میں حکومتوں کا قیام ہوچکا تھا اور سلطنتوں کے دائروں مین کتابت جاری تھی۔ اُس زمانے میں جو خط جاری تھا وہ سومری کہلاتا تھا سومری قوم دراصل سامی عرب تھے، اور سام حضرت نوح کے فرزند تھے لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے وقت حضرت نوح کی کیا عمر تھی؟

توارۃ (۱) مقدس باب پیدائش نمبر ۹ آیت نمبر ۲۹ مطبوعہ لندن (۱۸۸۷ء) کی رو سے حضرت نوح نے ۹۵۰ برس کی عمر پائی اور طوفان کے بعد ۳۵۰ برس تک زندہ رہے، طبری (۲) (صفحہ ۱۹۸، جلد اول) مطبوعہ لیڈن، ہالینڈ کی تحریر کے مطابق طوفان کے وقت حضرت نوح کی عمر ۶۰۰ سال تھی، اس کے بعد ۳۴۸ برس حیات پائی۔ یعقوبی (۳) (صفحہ ۱۴، جلد اول) مطبوعہ ہالینڈ میں تحریر ہے کہ قران پاک کی صراحت کے مطابق حضرت نوح نے ۹۵۰ برس کی زندگی پائی۔ متعدد محققین جغرافیہ نے کافی تحقیقات کے بعد طوفان نوح کے متعلق جو سنین قائم کئے ہیں اُن میں بائبل

۱-۲-۳۔ تحقیقات ماہر صفحہ ۲۵۔

سبعینه (Sepugint)(۱) کا نسخه سب سے زیاده معتبر مانا جاتا ھے کیونکه اس نسخه کی ستر علماء بنی اسرائیل نے صحت کی تھی ۔ اس نسخه کی رو سے طوفان نوح ۳۲۴۶ ق م آیا تھا ۔ اب اگر ان اعداد میں ۶۰۰ برس اور جمع کئے جائیں تو نتیجه یه نکلتا ھے که ۳۸۴۶ ق م بابل میں خط سومری رائج تھا ۔

اسی تاریخ ابجد کے ضمن میں همارے سامنے ایک اور دلچسپ تحقیق موجود ھے ۔ علامه ابن ندیم (۲) کی روایت کے بموجب حضرت آدم نے اپنی وفات سے ۳۰۰ برس قبل اُن ۲۱ صحائف آسمانی کو جو اُن پر نازل ھوئے تھے اینٹوں پر لکھا تھا ، جبکه بابل میں سومری قوم (۴۰۰۰ ق م) حکمران تھی ۔ اب اگر کتابت کا آغاز حضرت آدم کے عهد سے مانا جائے تو اس حساب سے بابل میں تقریباً ایک ھزار برس پہلے کتابت جاری تھی ۔ همارےخیال میں اسکی شرح یوں کی جاسکتی ھے که اول حضرت آدم نے آسمانی صحائف کو اینٹوں پر لکھا پھر تحفظ کے خیال سے اُن اینٹوں کو پخته کیا ۔ تاریخ شاھد ھے که یه خشتی کتبات طوفان نوح میں غرق ھوگئے تھے ۔ ابن ندیم کی یه روایت اس لحاظ سے بھی قابل تسلیم ھے که بابل کے آثار قدیمه سے عهد اشور بنی پال (۶۶۸ ق م) وغیره کے خشتی کتبات بر آمد ھو چکے ھیں جن پر پوری کتابیں تحریر ھیں اور یه وه طریقه تھا جس کے موجد حضرت آدم تھے ۔

جرجی زیدان اپنی تاریخ مصر الحدیث مطبوعه مصر میں رقم طرازھے که مصر کی قدیم تاریخ مختلف خاندانوں پر

---

۱ ۔ تحقیقات ماھر صفحه ۱۳ ۔ ۲ ۔ تحقیقات ماھر صفحه ۲۰ ۔

مشتمل تھی ۔ مصر میں حکومت کا آغاز ۴۰۰۰ ق م سے ھوا تھا اور مصر کے پہلے خاندان کا بادشاہ میناؤس تھا ۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس بادشاہ کا جو مقبرہ برآمد کیا ھے اُس کی برآمد شدہ نادر اشیاء سے ظاھر ھوتا ھے کہ اُس عہد میں ایک ایسا خط رائج تھا جو بلا تکلف لکھا جاتا تھا ۔ یقیناً اس لحاظ سے یہی دنیا کا قدیم ترین خط سمجھا جا سکتا ھے کیونکہ بجز اس خط کے مورخین کو کوئی دوسرا خط ابتک حاصل نہیں ھوا ۔

اسلامی عقیدے کے مطابق ھر علم و فن کا آغاز وحی الہی سے ھوتا ھے ، سوال یہ ھے کہ وہ کون سا خط تھا جس میں حضرت آدم پر صحائف نازل ھوئے اور اُن کے بعد حضرت ادریس نے کون سے خط کو ترقی دی ۔ کتاب التیجان مطبوعہ دائرۃ المعارف ، حیدر آباد دکن میں حضرت وھت سے روایت ھے کہ حضرت ادریس پر پہلی وحی میں ” بسم اللہ الرحمن الرحیم “ اور تیسری وحی میں پوری ابجد نازل ھوئی اور یہ سریانی زبان میں تھی نیز یہ کہ حضرت ادریس دنیا میں پہلے کاتب ھیں ۔ یہ روایت اول الذکر روایات کی تردید کرتی ھے لیکن اسکی تطبیق اسطرح ھوسکتی ھے کہ حضرت آدم کے عہد میں جو ابجد نازل ھوئی تھی اسکی تکمیل حضرت ادریس نے فرمائی ۔ بہر نوع چونکہ حضرت آدم اور حضرت ادریس کے عہد کے خطوط کا آج کوئی نمونہ دنیا میں موجود نہیں ھے اس لئے اس پر مزید بحث خارج از بحث ھے ۔ علامہ ابوالعباس قلقشندی کی کتاب ”صبح الاعشی“ مطبوعہ مصر کے مطالعہ سے یہ واضح ھوتا ھے کہ جہاں تک انبیاء کرام کے خط وحی کا تعلق ھے اسکا نام

"توفیقیہ" ہے اور اس میں جو اضافے ہوئے اسکا نام "خط اصلاحیہ" ہے۔

ان امور سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں جسقدر نمونے خطوط کے موجود ہیں آنکی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے اور مصری ہی ابجد یعنی خط کے موجد قرار پاتے ہیں اگر ان تمام خطوط کے باہمی تعلق اور آن کی ارتقائی کیفیتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو ایک شجرہ مرتب ہوجاتا ہے جسکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ شجرہ کی مدد سے تمام خطوط با آسانی سمجھ میں آجائیں گے۔ یہ خطوط حسب ذیل ہیں:

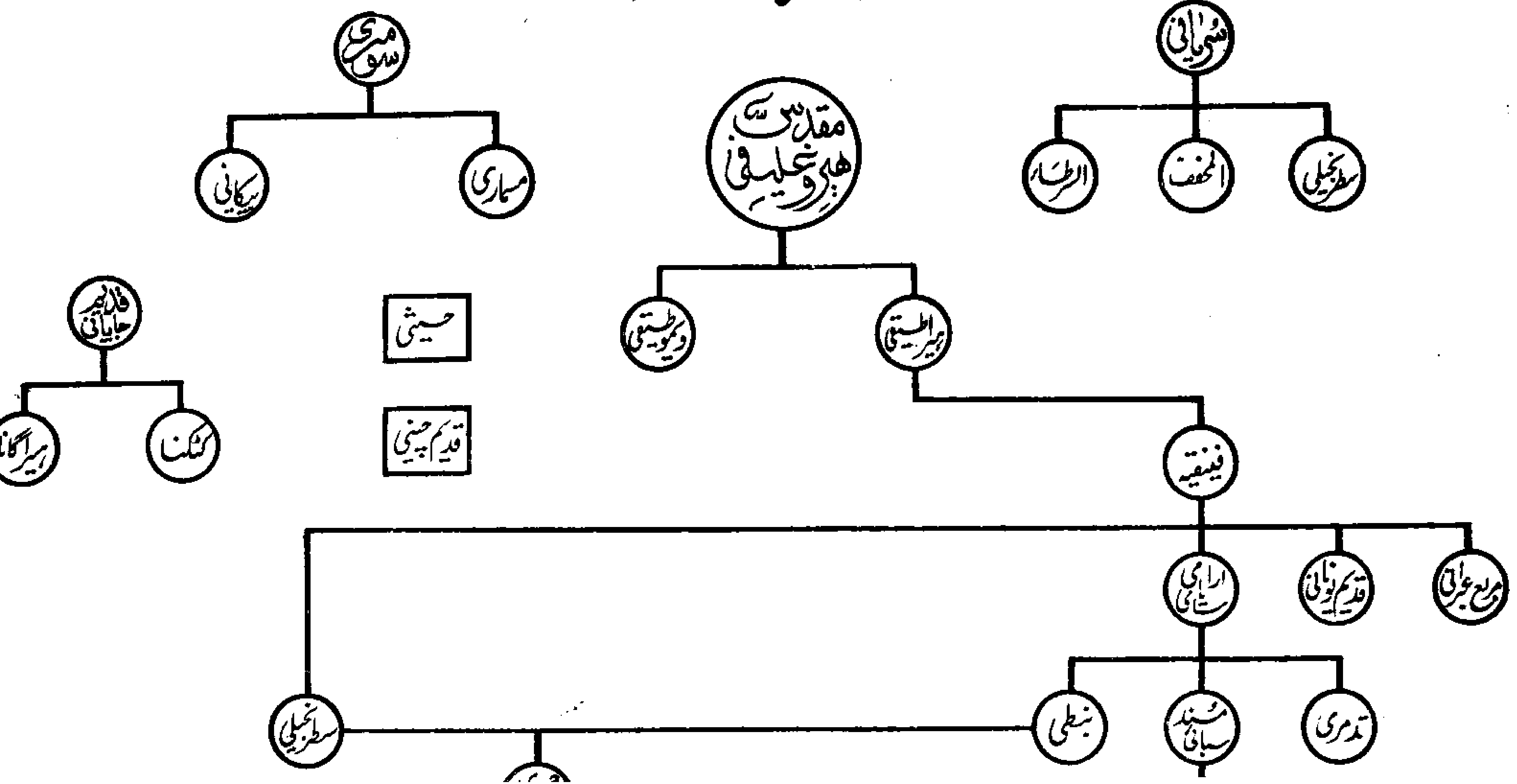
خط سریانی: اس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

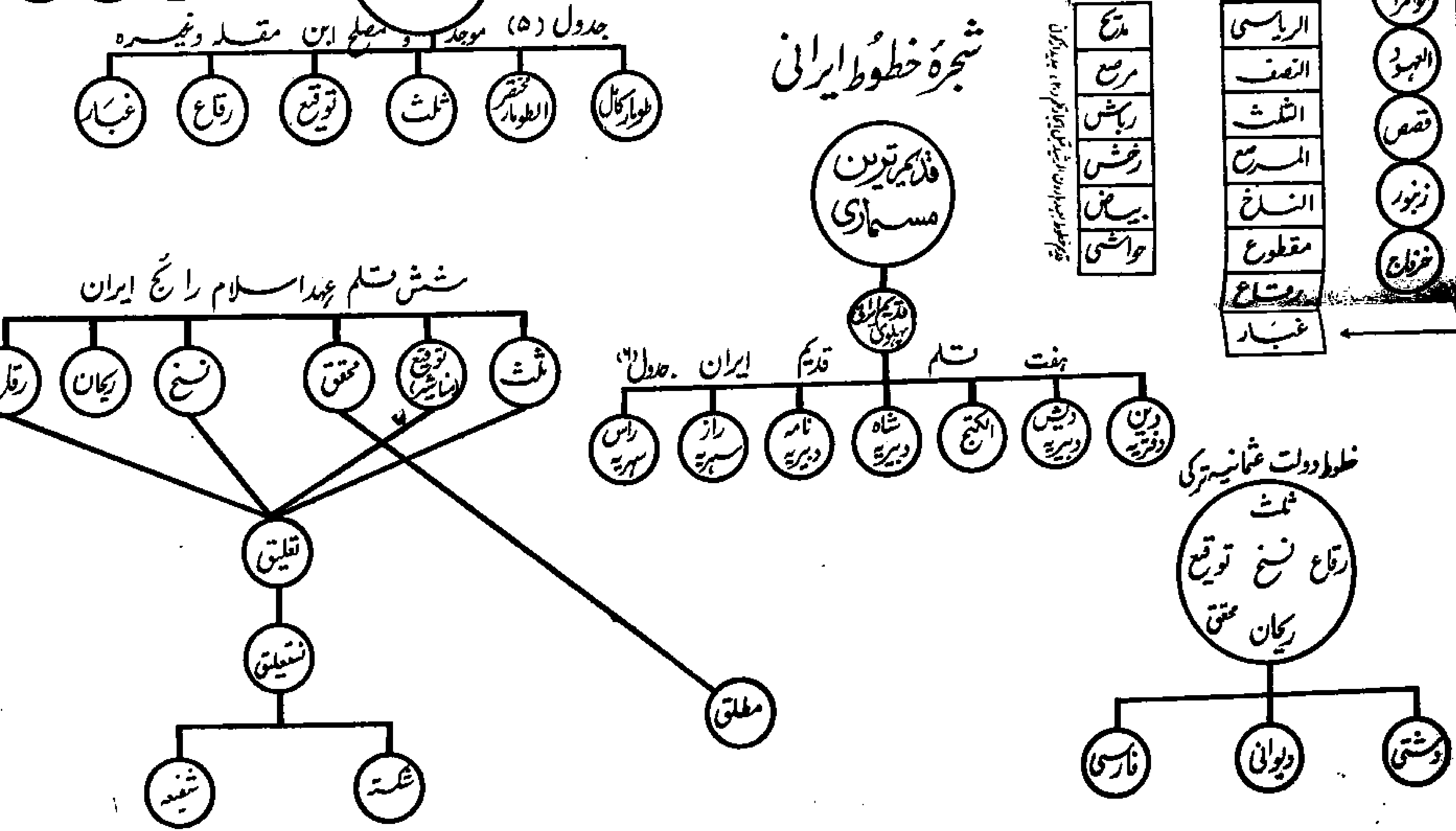
خط سطرنجیلی، المخفف، السرطا: ان خطوط کی ایجاد مصری خطوط کے زوال اور فنیقیہ کے بعد ہوئی۔ ان میں سطرنجیلی آگے چل کر ایک کامیاب خط کی صورت میں ابھرا اور خط کوفی قدیم کے لئے ایک بنیادی خط ثابت ہوا۔ باقی دونوں خطوط گوسریانی کی مشہور شاخیں ہیں لیکن وقتی طور پر پیدا ہوئے اور فنا ہوگئے۔ بنیادی خطوط ہونیکی وجہ سے ان کو علیحدہ شجرہ کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

خط سومری: یہ خط قدیم اہل بابل کی یادگار ہے جو طوفان نوح سے ۴ ہزار برس قبل مسیح رائج تھا اس کے موجد سامی عرب تھے۔

مسماری، پیکانی یا میخی: خط مسماری کو کلدانیوں (عراقی، بابلی، اشوری) نے فنیقی قوم سے سیکھا تھا

شجرۂ خطوط


سومری
مسماری
سیکانی
مقدس ہیروغلیفی
ہیراطیقی
دیموطیقی
سریانی
سطرنجیلی
المخفف
قدیم جاپانی
ہیراگانا
حبشی
قدیم چینی
فینیقیہ
مربع عراقی
قدیم یونانی
تدمری
مسند سبائی
نبطی
سطرنجیلی



بشکریہ ''ماہ نو'' کراچی – پاکستان

ابتدا حضرت ابراہیم سے ہوئی ۔ یہ خط ابتدا میں مصور تھا ۔ حمورابی خاندان نے جو (۲۳۶۰ ق م) بابل پر حکمران تھا اسے پیکانی یا میخی خط میں تبدیل کردیا ۔ اسکی شکل آہنی میخوں یا تیروں سے مشابہ تھی ۔

مقدس ہیرو غلیفی : یہ مصریوں کا سب سے پہلا مذہبی خط تھا، اسکا ہر حرف مصور تھا ۔ اس کے کاتب مندر کے پجاری تھے جو پتھروں اور لکڑی کے تختوں پر لکھا کرتے تھے ۔ اہل مصر چونکہ ابتدا میں وحوش کی پرستش کیا کرتے تھے اس لئے اظہار خیال کا ذریعہ حیوانات کی تصاویر قرار دیا گیا مکمل ابجد انہی تصاویر میں بنائی گئی ۔ آسانی کے خیال سے انھوں نے اس کی دو قسمیں کردیں :

ہیراطیقی (ہیراڈک) : یہ پہلی قسم تھی جسکا تعلق براہ راست مذہبی احکامات سے تھا، یہ خط شاہی دفاتر میں جاری تھا ۔ اگرچہ یہ کافی رواں تھا لیکن حروف میں کچھ کجی تھی اس لئے ہیراٹک کہلایا ۔ اس خط میں پوری تصویر کا صرف ایک جزو باقی رہ گیا اور کاغذ پر لکھا جانے لگا ۔ حضرت ابراہیم سے ۵۰۰ برس قبل کی کتابیں اس خط میں موجود ہیں ۔

دیموطیقی (وڈاٹک) : یہ دوسری قسم تھی، اس میں پہلے خط سے زیادہ روانی تھی، مصر میں جب سولھواں خاندان حکمران تھا، اس وقت یہ خط اپنے پورے شباب پر تھا ۔ اس تقسیم سے مصریوں کو ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مصوری کی زحمت سے قدرے نجات مل گئی ۔

فنیقیه (۱) : (اهل فنیشیا) مصریوں کے شاگرد ہوئے اور انھوں نے ہیرو غلیفی سے اپنا جداگانه خط پیدا کیا جو مصری خطوط سے زیادہ واضح اور شاندار تھا، اس طرح عہد قدیم کے یه چار خط اصل قرار پائے اور انکی شاخیں تمام دنیا میں پھیلیں -

مربع عبرانی : عبرانیوں میں ان کا ایک قدیم خط رائج تھا، جدید مربع عبرانی دراصل فنیقیه قوم کا عطیه ہے جس کی بنیاد (۵٦۰ ق م) بابل میں پڑی - یه خط فنیقیه سے زیادہ مہذب اور واضح تھا - بعض لوگوں کا خیال ہے که عربی عبرانی کی شاخ ہے یه غلط ہے - عربی بجائے خود ایک مستقل زبان ہے - دراصل حضرت عبیر جن کے نام سے یه زبان اور خط مشہور ہوا حضرت نوح کی اولاد سے تھے -

قدیم یونانی : یونانیوں کا اپنا کوئی خاص خط نه تھا - انھوں نے مصریوں سے اسکی تعلیم حاصل کی لیکن جب یونانی مصر پر قابض ہوگئے تو انکی حکومت کے زیر اثر تینوں مصری خطوط زوال میں آگئے - اب یونانیوں نے فنیقی خط کو سامنے رکھکر قبطی خط میں یونانی حروف شامل کئے اور اپنا جداگانه رسم الخط ایجاد کیا - قبطی خط بھی یونانی حروف سے مرکب تھا جو آغاز اسلام

---

۱ - یه قوم ابتدا میں ساحل بحرین اور خلیج فارس پر آباد تھی جب اس پر یورش ہوئی تو نواح یمن میں آباد ہوئی پھر دوسرے انقلاب میں ارض کنعان (شام) پہنچی - ساحل روم پر شہر صور (ٹائر) اور صیدا (سیڈان) انھی کی یادگار ہیں اسی قوم نے کلدانیوں، یونانیوں اور عبرانیوں کو کتابت اور تجارت کی تعلیم دی، از تحقیقات ماہر ۲۰۲

تک جاری رہا لیکن خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے گورنر عبداللہ نے ۸۷ھ م ۷۰۶ء میں اس خط کو عربی خط میں تبدیل کردیا۔

ارامی یا سامی: سلطنت اشوریہ (بابل) جب رو بہ زوال ہوئی تو اس کی ابجد، جس کا تعلق فنیقیہ سے تھا، متمدن دنیا میں پھیلی۔ اس سے چند قلم پیدا ہوئے۔ ان میں ایک خط ارامی تھا۔ ارام حضرت سام کے بیٹے اور حضرت نوح کے پوتے تھے۔ یہ قبائل ساحل بحرین پر دیگر عربوں کے ساتھ آباد تھے۔ جن کی زبان قریب قریب بالکل عربی تھی جس میں ارامی زبان کے مادے بھی بکثرت شامل تھے۔ ابتدا میں فنیقیہ اور ارامی خطوط میں بھی زیادہ فرق نہ تھا کیونکہ ارامی خط فی الاصل مصری خطوط کو سامنے رکھ کر معمولی فرق کے ساتھ جاری کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ فرق نمایاں ہوگیا۔

جب سامی اقوام کا متمدن دنیا سے ربط ضبط بڑھا تو انھوں نے اپنی قدیم زبان سومری کے علاوہ ارامی زبان اور خط دونوں کو اختیار کرلیا۔ اسی لئے ارامی خط کا دوسرا نام سامی ہے۔ اس کی دو شاخیں مشہور ہیں۔

تدمری: یہ ارامی خط کی پہلی شاخ ہے۔ دراصل یہ قلم تدمر (پال مائر) کے شہریوں کا تھا۔

نبطی: یہ دوسری مشہور شاخ ہے۔ اصل میں یہ قلم پڑا یا بطرا والوں کا خط تھا جو بدین، ارض سیناء، فلسطین اور حوران (ممالک شام) میں رائج تھا۔ نبطی دراصل حضرت اسماعیل کی اولاد ہیں۔ حضرت

اسماعیل کے ایک صاحبزادے کا نام "نابت" تھا۔ دو تین صدی قبل مسیح نبطیوں کی حکومت نجد سے سواحل بحر احمر، عقبہ اور بادیۂ شام تک دراز تھی۔ ان کا مرکز شہر بطرا تھا اور زبان عربی تھی۔ ابتدا میں اُن کا خط مسماری تھا جو انہوں نے سومریوں سے حاصل کیا تھا۔ سامیوں کی طرح جب نبطیوں کے بھی متمدن دنیا سے تعلقات پیدا ہوئے تو وہ سیاسی وتجارتی اغراض کے ماتحت اپنا مسماری خط چھوڑ کر ارامی خط میں کتابت کرنے لگے۔

مسند یا مسند سبائی: شمالی عرب میں خط ارامی کی تیسری شاخ مسند سبائی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ موجودہ دور میں یمن کی جو تاریخ کتابت آثار قدیمہ سے مرتب کی گئی ہے اس میں یمن کے تین دور دکھائے گئے ہیں۔ اول ملوک معین دوم ملوک سبا اور سوم ملوک حمیر۔ یہ تمام بادشاہ نسل کے اعتبار سے ایک تھے لیکن ان کی حکومتوں کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اہل معین کی زبان سبائیوں سے مشابہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انکی ابجد مسند حمیری کے نام سے مشہور ہوئی جس کا بیان آگے آئیگا۔ مسند سبائی سے تین قلم نکلے۔

صفوی: علاقہ حوران (شام) میں جبل صفا واقع ہے۔ تمام کتبات صفوی کہلائیے۔

ثمودی : ثمود عرب کی قدیم قوم تھی، اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔

لحیانی : شمالی عرب میں لحیان مشہور قبیلہ تھا ، اس کی کنیت سے لحیانی خط مشہور ہوا ۔

قبل اس کے کہ ہم مسند حمیری اور حیری یا قدیم کوفی کا ذکر چھیڑیں ۔ قدیم خطوط کے ضمن میں حیثی ، چینی اور جاپانی خطوط کا تذکرہ کریں گے تاکہ یہ سلسلہ اپنی جگہ مکمل ہوجائے ۔ ان تینوں خطوط کو بھی شجرہ میں علحدہ کھایا گیا ہے۔

حیثی : ولادت حضرت مسیح سے قبل حیثی ایک قوم تھی جو فراعنہ مصر کی ہم عصر تھی ۔ یہ شام سے ایشیائے کوچک تک آباد تھی ۔ اسکا خط بھی ہیرو غلیفی کی طرح مصور مگر بھدا تھا ۔ شہر حماتہ (شام) میں اس خط کے کتبات بر آمد ہوئے ہیں ۔

چینی : ایشیائی خطوط میں چینی ایک عجیب اور دلچسپ خط تھا کیونکہ اسکی کتابت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ چینیوں کا اعتقاد تھا کہ فیضان الہی کا نزول آسمان سے زمین کی طرف ہوتا ہے۔

جاپانی : یہ خط درختوں کی شاخوں کی طرح پیچدار تھا، اس لئے اہل عرب اپنی اصطلاح میں اسے شجر کہتے تھے، اس کی دو قسمیں ہیں : کٹکنا ، ہیرا گانا ۔ دراصل یہ دونوں جاپانی اور قدیم مغلئی چینی خط ھی کی شاخیں ہیں ۔ سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں سے بائیں جانب لکھے جاتے تھے اُن کا نظریہ یہ تھا کہ انسان سے حرکت طبعی کا آغاز ہمیشہ دائیں ھاتھ اور دائیں قدم سے ہوتا ہے ۔ جیسے آسمان دائیں سے بائیں یعنی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے ۔ اس کے برعکس ہندی ، قبطی ، رومی اور قدیم فارسی خطوط کی کتابت بائیں سے دائیں جانب ہوتی تھی ، کیونکہ حکمائے یونان کی تحقیق کے مطابق دوران خون قلب سے شروع ہوتا ہے اور قلب بائیں جانب ہے ، نیز قلب عقل کا مرکز ہے ۔

مسند حمیری : ہیروغلیفی سے ارامی یاسامی خط تک (مربع عبرانی اور یونانی قدیم کو نظرانداز کرتے ہوئے کیونکہ وہ خارج از بحث ہیں) خطوط کی پانچ منزلیں پوری ہوتی ہیں چھٹی منزل سطرنجیلی (شاخ فنیقیہ) خط تھا جو ظاھر ہے کہ مسلسل پانچ دور گزر جانے کے بعد نہایت واضح اور روشن بن چکا تھا لیکن جب اسے نبطیوں نے اختیار کیا تو اس میں پھر گنجلک پیدا ہوگئی جسکا عظیم رد عمل یمن میں جا کر ہوا ۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سطرنجیلی اور نبطی کے لطیف امتزاج سے مسند حمیری وجود میں آیا ۔

حیری یا قدیم کوفی : مسند حمیری کو اہل حیرہ نے مناسب اصلاح کے بعد اور بھی آراستہ اور مہذب کیا اور یہ

بسم الله الرحمن الرحيم ۝
قل اعوذ برب الفلق ۝ من شر ما خلق ۝
ومن شر غاسق اذا وقب ۝ ومن شر
النفثت في العقد ۝ ومن شر حاسد اذا

سورة الناس ۶ حسد ۝ مدنية ست آيات

بسم الله الرحمن الرحيم ۝
قل اعوذ برب الناس ۝ ملك الناس ۝ اله
الناس ۝ من شر الوسواس ۝ الخناس ۝
الذي يوسوس في صدور الناس ۝ من الجنة
والناس ۝ خ

كتبه محي الدين اورنگ زيب عالمگير
سنه ١٠٦



اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا
ایک صفحہ

فرمانِ والاشان حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، بنام سلطانِ مقوقس (مصر)



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اِلَی الْمُقَوْقِسِ عَظِیْمِ الْقِبْطِ سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی. اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَدْعُوْکَ بِدِعَایَۃِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤْتِکَ اللّٰہُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَعَلَیْکَ اِثْمُ الْقِبْطِ. یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ٥ نامۂ مبارک کے بعض الفاظ اس سے کچھ مختلف ہیں جو کتبِ سیر میں درج ہیں۔ روایۃ بالمعنی کا عموم مدنظر رہتے ہوئے الفاظ میں یسیر تغیر ہو جانا مستبعد نہیں۔

ماخوذ از بلاغ مبین مکاتیب سید المرسلین

حیری یا قدیم کوفی کے نام سے مشہور ہوا ۔ واضح رہے کہ یہ اصلاحی خط کوفی نہ تھا جسکو عام طور پر خط کوفی جدید سمجھا جاتا ہے بلکہ محض وہ خط تھا جسکو اہل یمن اور اہل مکہ نے حیرہ والوں سے حاصل کیا تھا ، اس عہد اور اس خط تک ، نقاط ، اعراب ، علامات اور اوقاف کا دستور بھی وضع نہیں ہوا تھا اور الف بھی سیدھا نہیں بنا تھا بلکہ نیچے کا حصہ مڑا ہوا تھا اور اسکی شکل یہ تھی ' ا ' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی کرم اللہ وجہ اور آن کے صاحبزادگان حضرت حسن رض اور حسین رض تک کی تمام تحریریں اسی خط حیری یا کوفی خط میں ہیں ، لہذا حیری کو جدید کوفی سمجھنا اور دوسروں کو یہ باور کرانا کہ رسول مقبول ، چاروں صحابۂ کرام اور حضرت حسن رض وحسین رض کے فرامین یا نسخہ ہائے قرآن مجید جو آن کے زمانے میں لکھے گئے جدید خط کوفی میں تھے سراسر غلط اور ایک فاش غلطی ہوگی ۔

ہمارے اس دعویٰ کا سب سے بڑا ثبوت رسول اکرم کے وہ مقدس فرامین رسالت ہیں جو حضور نے مختلف شاہان وقت کے نام ارسال فرمائے تھے ، امتداد زمانہ کے ہاتھوں اس دولت بیش بہا کابیشتر حصہ تلف ہوچکا ہے ، اس وقت صرف دو فرامین پائے جاتے ہیں ۔ پہلا فرمان مبارک 'مقوقس' شاہ مصر کے نام ے ھ میں بھیجا گیا تھا ۔ یہ مصر کے شاہی خزانہ میں محفوظ تھا جسکا عکس مستشرقین یورپ کی وساطت سے اول رسالہ الہلال ، مصر میں بعد ازاں بیت المقدس سے عاشقان رسول نے شائع کیا ۔ غالباً یہ فرمان اس وقت ترکی کے عجائب خانہ میں دعوت نظارہ دے رہا ہے ۔ دوسرا فرمان ۱۰ ھ کا ہے جو مسیلمہ کذاب ،

والئی یمامہ (فارس) کو بھیجا گیا تھا ۔ اس کا عکس ۱۸۹۶ء میں لندن پکچرسیگزین میں شائع ہوا تھا ۔ ان فرامین رسالت کے علاوہ حضرت امام حسن رض کے رقم کردہ قرآن مجید کے ایک صفحہ کا عکس سالنامہ مجلہ کابل (۱۲۱۱ھ) میں شائع ہواتھا۔ ان کتبات مقدس کی روشنی میں جدید خط کوفی اور 'خط حیری' کا فرق روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے۔

عربی خطوط : قدیم خطوط کی تاریخ اس جگہ تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور عربی ابجد یا خطوط کا آغاز ہوتا ہے، مشہور مورخ ہشام بن محمد کی روایت کے بموجب عربی خط کا بانی قبیلہ نصر بن کنانہ میں سے تھا ، دوسری روایت حمیر بن سبا کو اسکا موجد ٹھیراتی ہے۔ بہر حال یہ سب قبیلۂ قریش ہی کے افراد تھے ۔

حضرت آدم پر جو ابجد نازل ہوئی تھی ، اسکی صحیح تعداد ۲۸ حروف پر مشتمل ہے۔ 'لام الف، ابجد کا مستقل حرف نہیں ہے۔ یہ چوتھی صدی عیسوی کی ایجاد ہے، رسول اکرم پر دوسری ترتیب میں ۱۴ حروف نازل ہوئے جو جدول (۱) کی پہلی سطر میں دکھائے گئے ہیں ۔ ان سب کی شکلیں مختلف ہیں ۔ باقی ۱۴ حروف جو دوسری سطر میں درج ہیں وہ باہم مشابہ ہیں ۔ اس لحاظ سے عربوں کی ابجد میں کل ۲۸ حروف ہوئے ۔

عربی ابجد

۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	
ی	ه	ن	م	ل	ک	ق	ع	ط	ص	س	ر	ح	ا	جدول
ف	ش	غ	ظ	ض	ز	ذ	د	خ	ح	ج	ث	ت	ب	۱

اب مصری ابجد جدول (۲) پر غور کیجئے ، اِس میں ۲۲ حروف تھے جو فنیقی ، ارامی ، سطرنجیلی اور حیری میں بھی برقرار رھے ۔ علماء قدیم نے ان مفردات کو مخارج حروف کا لحاظ رکھکر ابجد ، ھوز ، حطی ، کلمن ، سعفص قرشت چھہ کلمات یا الفاظ پر تقسیم کردیا ۔ اھل عرب نے ان ۲۲ حروف میں چھہ حروف کا اضافہ کر کے ' ثخذ ' اور ' ضظغ ' دوکلمات یا الفاظ اور ایجاد کئے آخرالذکر چھہ حروف (ثخذ ، ضظغ) لسان عرب ھی سے مخصوص ھیں ، دوسری زبانیں بجز 'مسند سبائی' اور 'مسند حمیری' ان کے مخرج سے قطعی محروم ھیں ۔

مصری ابجد جدول (۲)

(۱) ابجد ۴

ا	ب	ج	د
۱	۲	۳	۴

(۰) هوز ۳

ه	و	ز
۵	۶	۷

(۲) حطی ۳

ح	ط	ی
۸	۹	۱۰

جدول ۲

کل حروف ۲۲

(۴) کلمن ۴				(۵) سعفص ۴				(۶) قرشت ۴			
ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت
۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰

عربی ایجاد —

(۷) ثخذ ۳			(۸) ضظغ ۳		
ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

کل تعداد
۲۲
۶
۲۸

اس مقام پر یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عربوں نے ان ۲۸ حروف کی تخصیص کیوں قائم کی ۔ بقول علامہ ابن ندیم عربوں نے یہ ۲۸ حروف منازل قمر کے حساب سے وضع کئے تھے ، اسی طرح عرب کا کوئی کلمہ سات حروف سے زیادہ نہیں ہے ؛ یہ نسبت بھی انھوں نے سات سیاروں (پروین یا ثریا) کی مناسبت سے رکھی ہے ، عربوں کے حروف الزوائد بھی زیادہ سے زیادہ ۱۲ ہیں اور یہ تعداد بروج فلک کے مطابق ہے ۔ اصل اعراب (زیر ، زبر ، پیش) صرف تین ہیں کیونکہ حرکت طبعی بھی تین ہی ہیں ، یعنی حرکت حرکت زمین اور حرکت فلک ۔ نقاط کی ایجاد کا

عربوں ھی کے سر ھے اور یہ حضرت علی رض کے عہد کی یاد گار ھے۔ پہلے یہ نقاط کچھ خوشنما نہ تھے ۔ ابن مقلہ نے مدور کر کے ان میں بھی حسن پیدا کردیا اور حروف قدیم کی ترتیب ابجد ھوز وغیرہ کو بھی یکسر بدل کر ھم شکل حروف برابر برابر لکھے۔

خطوط مرموزات : انھی مفرد حروف کی اساس پر بلحاظ ابجد ھوز وغیرہ ماھران مرموزات نے خفیہ تحریروں اور تاریخی مادے نکالنے کا فن ایجاد کیا، یعنی حروف ابجد کی قیمت ایک سے ھزار تک کے اعداد میں مقرر کردی جیسا کہ جدول ۲ سے ظاھر ھے پھر مختلف قواعد اور طرز تحریر کے مطابق ان خطوط کے مختلف نام مقرر کئے جو حسب ذیل ھیں ۔

خط ھندسہ : (خط اشارہ ، خط رمز ، خط کنایہ، خط مرموزہ) ایک ھی خط کے مختلف نام ھیں ۔ اس خط یا خطوط سے مراد وہ تحریر ھے جس میں حقیقی اور اصلی اشکال حروف کو بعض مخصوص علامات ، مقررہ نشانات یا اعداد میں اسطرح ظاھر کیا جائے کہ بجز واقف اشخاص کے کوئی دوسرا نہ سمجھ سکے، اس کی تحریر کا قاعدہ یہ ھے کہ پہلے ایک خط صفحہ کے عرض میں کھینچا جاتا ھے پھر مطلوبہ الفاظ کے حروف کو اعداد ابجد کے مطابق اس لکیر کے اوپر اور نیچے مقررہ قواعد کے ماتحت لکھتے ھیں ۔ چونکہ اس تحریر کے کئی قاعدے اور انکی شرح بڑی طول طویل ھے اسلئے ھم اسکی صرف ایک ھی مثال پرا کتفا کریں گے ۔ مثال : غضنفر علی کو اسطرح لکھیں گے۔

۱۳۷،۸۸

قاعدہ تاریخی مادہ :

مثلاً "یوسف" (ی ـ و ـ س ـ ف) کی قیمت ۱۵۶ ہے
۱۰ ۶ ۶۰ ۸۰

یا ایک بچی جو ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئی ہو اسکا ایک نہایت پیارا تاریخی 'نام درنظر' (د ، ر ، ن ، ظ ، ر)ہوسکتا ہے۔
۴ ۲۰۰ ۵۰ ۹۰۰ ۲۰۰

اسی ضمن میں ہندی زبان کے مشہور شاعر کبیر کے ایک دوہے کی مثال بھی خالی از لطف نہ ہوگی۔ کبیر کے دوہوں کو دنیائے ادب میں ایک خاص مقام اور درجہ حاصل ہے۔ کبیر کے منہ سے حضرت محمد صؐ کے مقدس نام کی عالمگیر وسعت کا اندازہ اور حضرت محمد صؐ کے ساتھ کبیر کی عقیدت ملاحظہ ہو۔ کبیر کہتا ہے ،

نام لو ہرو ستو کا چو گن کر لو وائے
دو ملا یو پچگن کرلو بیس بھاگ لگائے
بچے کو اب تم نو گن کرلو اور دیو دوملائے
کہت کبیر ہر و ستو میں نام محمد ص پائے

ترجمہ :

دنیا کی کسی شے کا نام لو ، اس کے اعداد کو چو گنا کرلو ، اس میں اول دو جمع کرو پھر اُن کو پانچ گنا کرلو ، اب بیس سے تقسیم کردو ، باقی کو پھر نو گنا کرلو اور آخر میں دو ملادو ، ہمیشہ نام محمد ص پاؤ گے۔

مختصر فارمولا :

۲۰ ÷ ۵ × ۲ + ۴ × کسی نام کا عدد

محمدص = ۹۲ = ۲ + ۹ × باقی اعداد

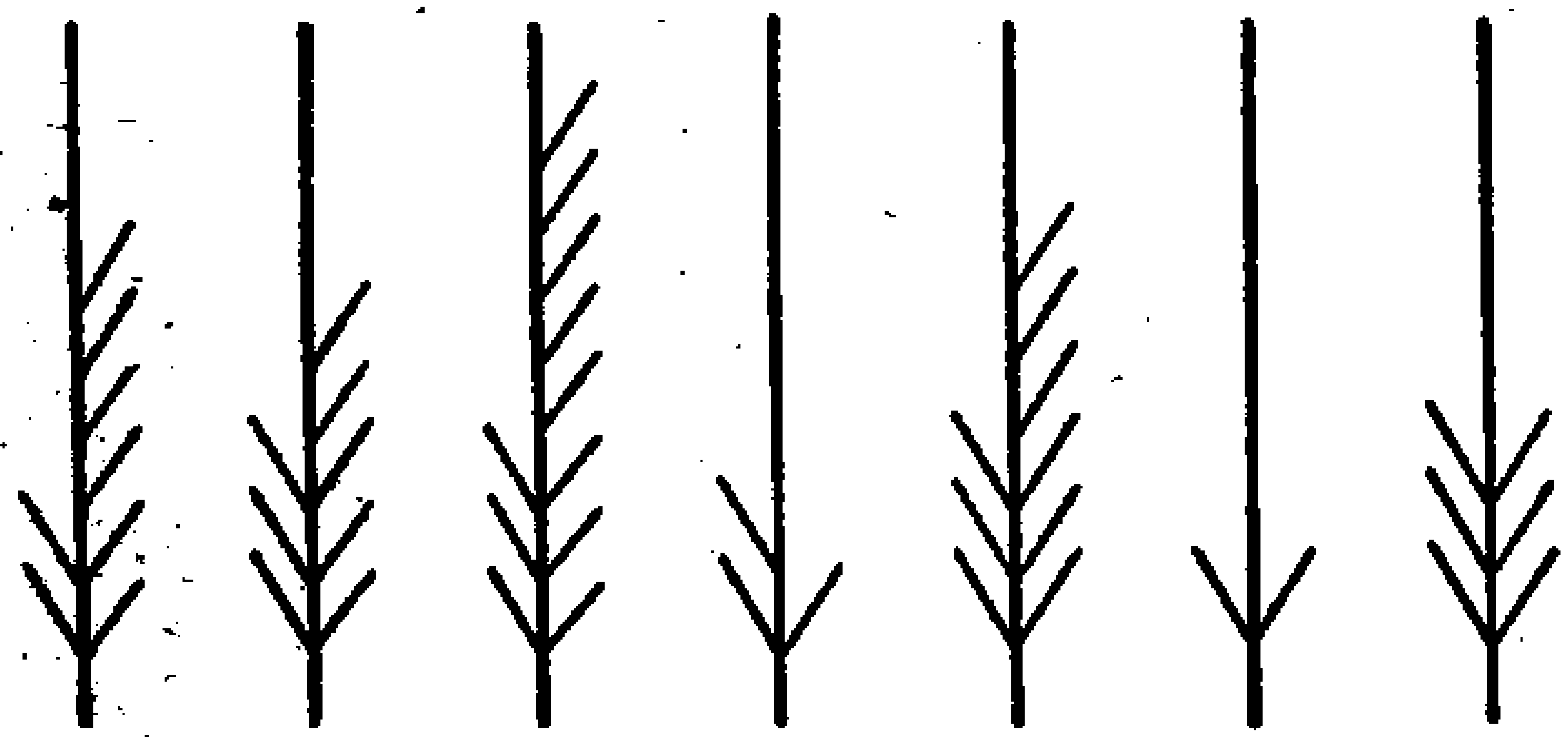
واضع رہے کہ محمدص کے حروف کی قیمت بحساب ابجد ۹۲ برآمد ہوتی ہے۔

مثال :

فرض کیجئے لفظ ' آم ' ہے۔ آم (ا/۱ ، م/۴۰) کے کل اعداد ۴۱ ہیں فارمولا کے مطابق اس کا حل یہ ہے :

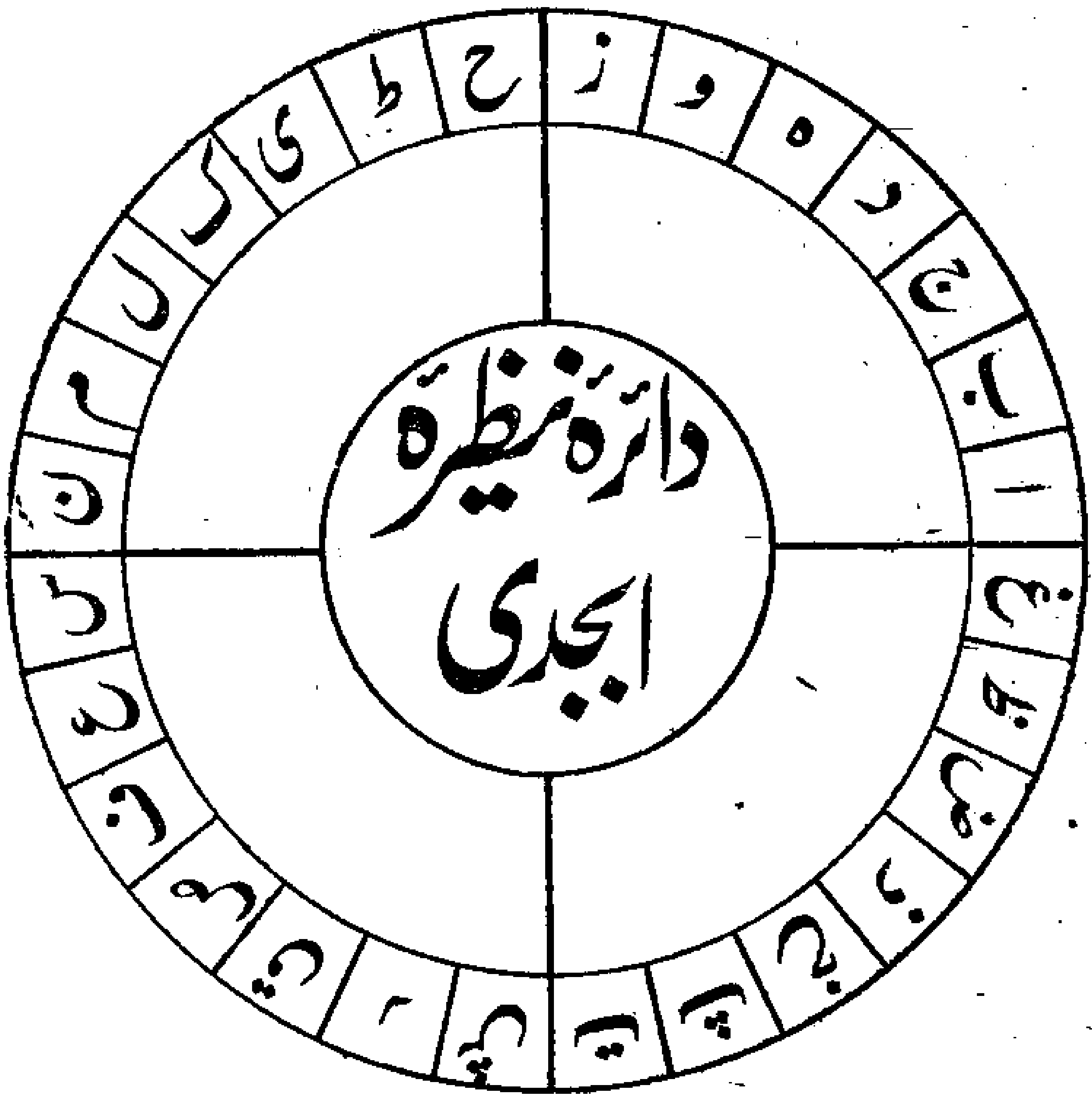
۴۱
۴
———
۱۶۴
۲
———
۱۶۶
۵
———
۲۰) ۸۳۰ (۴۱
۸۲۰
———
۱۰
۹
———
۹۰
۲
———
۹۲ = محمدص

خطسرو: (۱) مزکورہ بالا خطوط کی طرز کا ایک خط جو باریک لکیروں سے بولوں کے مقررہ اشاروں میں سرو کے درخت کی شکل میں لکھا جاتا ہے ، یعنی ابجد ہوز وغیرہ کے مجموعوں کے مطابق کھڑے خط کے دائیں بائیں آڑی لکیریں مقررہ تعداد میں کھینچی جاتی ہیں ، اس کے ایک قاعدے کی مثال یہ ہے:
"یارب غفور" اس طرح لکھا جائیگا :-



خط نظیرہ: یہ بھی خط اشارہ کی ایک قسم ہے جو اپنے موجد کے نام پر موسوم ہے چنانچہ دائرہ نظیرہ ابجد مشہور ہے۔ اس دائرہ میں حروف ابجد ، ہوز وغیرہ ایک دوھرے دائرے شکل میں اس کے خانوں میں لکھے جاتے ہیں جنکو حروف ... کی مدد سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

۱۔ ماخوذ از فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ، جلد ...



مثلاً لفظ 'نوخع' ہے ۔ نوخع کے حروف ن ، و ، خ ، ع کے مقابل دائرے میں دوسرے حروف غ ، ر ، ی ، ب آتے ہیں ، اس نوخع کا مطلب 'غریب' ہے ۔

غرض اسی انداز پر خفیہ تحریروں کی اور بھی بہت سی قسمیں اور ترکیبیں ہیں لیکن چونکہ ان کا فن خوش نویسی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ہم اس موضوع کو کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں ، اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اپنے اصل مبحث پر آتے ہیں ۔

ماخوذ از فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران جلد چہارم ۔

عربوں میں رسم الخط کی ترقی کے اسباب میں سب سے بڑا سبب وحی الٰہی ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید نازل ہوا۔ حضرت ص کو کتابت وحی کے لئے کاتبوں کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے رسم الخط کی طرف توجہ فرمائی۔ غزوہ بدر میں ستر ۷۰ قیدی ایسے ہاتھ آئے جو نوشت و خواند سے واقف تھے۔ آپ نے اپنی حکمت سے ہر قیدی کا فدیہ آزادی یہ مقرر کیا کہ وہ دس آدمیوں کو کتابت کی تعلیم دے، اس طرح ایک قلیل مدت میں بیک وقت ۷۰۰ نفوس کتابت سے واقف ہوگئے اور اور پہلا دارالکتابت مدینہ منورہ ہوا۔ اس وقت مدینہ کے مقابلہ میں مکہ معظمہ میں صرف ۱۶ آدمی ایسے تھے جو لکھنا جانتے تھے۔ بعدازاں جب خلافت راشدہ کا آغاز اور اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تدریس و تدوین میں ترقی ہوئی تو ایک ربع صدی ہی میں سیکڑوں کاتب اور منشی پیدا ہوگئے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی حفاظت اور تبلیغ کے لئے چند نسخے لکھے گئے جن میں حضرت عثمان رض اور حضرت علی کرم اللہ وجہ پیش پیش تھے۔ اس وقت تک قرآن مجید کی کتابت میں نقاط اور اعراب کا رواج نہیں تھا۔ نقاط کی ایجاد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے عہد خلافت میں زیاد حاکم بصرہ کے ایماء پر ہوئی۔ ان نقاط کے موجد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ندیم خاص ابوالاسود تھے۔ ان نقاط نے پوری ایک صدی تک اعراب کا کام دیا۔ ابوالاسود کا دوسرا کارنامہ عربی نحو کے ابتدائی قواعد کی ترتیب اور تدوین تھا۔ ان کی وفات ۶۹ھ میں ہوئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا رسم الخط میں بھی مسلسل ترمیم واصلاح ہوتی رہی پہلے حیرہ علم خط کا مرکز تھا مگر خلافت بنی امیہ اور عباسیہ میں مدینہ اور مکہ کے علاوہ بصرہ اور کوفہ بھی خط کا مرکز بن گئے ۔ کوفہ کو ایسی تاریخی شہرت حاصل ہوئی کہ یہ شہر نہ صرف فن کتابت کا معلم ہوا بلکہ اکثر علوم عربی کا مبداء بن گیا ۔ چنانچہ لغت کی پہلی کتابت بھی جو خلیل بصری کی تصنیف تھی ، کوفہ ہی میں ہوئی ۔ جدید خط کوفی ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا ۔

خط کوفی جدید : اس کا آغاز خلیل بن احمد نحوی موجد علم عروض کے زمانے سے ہوا ۔ یہ عہد عباسی کا ایک نامور فاضل تھا ۔ اس نے قدیم خط کی اصلاح کی اور موجودہ اعراب جاری کئے۔ ۱۷۰ ھ میں وفات پائی ۔ اسی سال خلیفہ ھارو الرشید عباسی تخت نشین ہوا ۔ خلیل کے بعد علی بن حمزہ کسائی نحوی نے خلیل کے مہذب خط پر ایک اور غائر نظر ڈالی ۔ اس میں خوشنویسی سے زیادہ مصورانہ شان اور نقاط میں بانکپن پیدا کیا ۔ یہاں تک کہ اس خط کو قبول عام کی سند مل گئی اور اس خط کا نام 'خط کوفی' ہوا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے ۔ اب مصاحف کی کتابت اور دفتر انشاء کی مراسلت بھی اسی خط میں ہونے لگی ۔ کسائی نے ۱۸۲ ھ میں وفات پائی ۔ اسی عہد کو اس خط کی تاریخ سمجھنا چاہئیے ۔

عہد ہارون الرشید سے معتصم باللہ عباسی تک متعدد نامور خطاط ہوئے ۔ ان خطاطوں کے تذکروں سے بلا اختلاف یہ ثابت ہے کہ خط نسخ کے جس قدر بہترین نمونے دور حاضر میں ملتے ہیں ، ان سب کی اصل یہی خط کوفی ہے ۔ خط کوفی سے عہد ہارون الرشید تک بارہ قلم (جدول نمبر ۱) ایجاد ہوچکے تھے جن کی کتابت ہر قلم کی معنوی نسبت کے مطابق اسی خط میں ہوتی تھی ۔ ' تحقیقات ماہر ' میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے ۔ یہ بارہ قلم تیسری صدی ہجری تک رائج رہے ۔ ان بارہ قلموں پر عہد ہارون الرشید کے بعد آٹھ قلم (جدول نمبر ۲) کا اور اضافہ ہوا ۔ اس طرح خط کوفی سے جملہ بیس قلم نکلے ۔ ان بیس ۲۰ قلموں کے ساتھ ساتھ چھ قلم (جدول نمبر ۳) اور جاری تھے جو خوشنویسی اور کتابت کلام مجید کے لئے مخصوص تھے ۔ خلیفہ کے عہد میں گو ان تمام خطوط کے کاتب موجود تھے لیکن ان کے موجد اور معلم کون تھے ، اس باب میں تاریخ تقریباً خاموش ہے ۔ جب ابن مقلہ نے اپنے چھ خط (جدول نمبر ۴) ایجاد کئے تو یہ تمام خط یکسر متروک اور فنا ہوگئے ۔

خط نسخ : فی الاصل خط کوفی کا مصلح اعظم و اول ابوعلی محمد بن علی بن حسن بن عبداللہ ملقب بہ ابن مقلہ تھا ۔ ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا ۔ خلیفہ القاہر باللہ عباسی کا وزیر تھا ۔ لیکن بعض امور سیاسی میں اختلاف کے باعث ابن مقلہ نے خلیفہ کے خلاف سازش کی ، اس وقت تو وہ کسی نہ کسی طرح اس سازش کی پاداش سے بچ گیا ، کیونکہ سازش کے ماتحت خلیفہ معزول ہوگیا تھا ۔ لیکن جب اس کا بیٹا ابوالعباس راضی باللہ

ہوا اور سازش عیاں ہو گئی تو قید ہوا ۔ اس کا دایاں ہاتھ اور زبان کاٹ دی گئی اور اسی حالت میں بعمر ۵۶ سال ۳۲۸ھ میں وفات پائی ۔ ابن مقلہ کا انتہائی کمال یہ تھا کہ جب دایاں ہاتھ کٹ گیا تو کہنی میں کھپچی باندھ کر لکھتا اور لاجواب لکھتا ۔ اس نے ایک خاص روشنائی ایجاد کی تھی جس نے اس کے خط کو اور بھی روشن کردیا تھا ۔ اس عدیم النظیر خطاط نے خط کوفی اور معقلی کے لطیف امتزاج سے اول خط نسخ کے علاوہ پانچ اور قلم (جدول نمبر ۴) جاری کئے ۔ ان پانچ خطوں کے بعد چھہ قلم (جدول نمبر ۵) اور نکالے مگر ان کو نئے قلم کہنا درست نہیں ۔ دراصل یہ سب نسخ کی شاخیں ہیں جو ابن مقلہ اور دوسرے خطاطوں کی اصلاح کردہ ہیں ۔ دوسرے اصلاح کرنے والوں میں سے ایک مشہور و معروف خطاط ابوالحسن علی ابن ہلال بواب (دربان) تھا ۔ ابن بواب، ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً ۸۴ سال بعد پیدا ہوا اور آسمان شہرت پر بدر کامل ہو کر چمکا کیونکہ خط نسخ کی تہذیب اور حسن وجمال کا سہرا آخر میں ابن بواب کے سر رہا ۔ یہ $\frac{۴۱۳ھ}{۱۰۳۱ء}$ یا ۴۲۳ھ میں بمقام بغداد فوت ہوا ۔

ابن بواب کے بعد نسخ کے باکمالوں میں تین یاقوت مشہور ہوئے ۔

یاقوت اول : امین الدولہ ابوالزر یاقوت بن عبداللہ موصلی ملک شاہ سلجوقی کا درباری تھا ، اس لئے یاقوت الملکی مشہور ہوا ۔ ۴۲۲ھ میں بمقام موصل وفات پائی ۔

یاقوت دوم: یاقوت بن عبداللہ الرومی الحموی ہوا اس نے ۶۳۶ھ میں وفات پائی۔

یاقوت سوم: یاقوت بن یاقوت بن عبداللہ رومی المستعصمی۔ یہ باکمال ابوالمجد خواجہ عمادالدین رومی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ خط نسخ کا آخری امام یہی ہوا ہے جس پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا ۶۹۸ھ / ۱۲۹۹ء میں وفات پائی۔ اس یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید اب تک نواب زادہ سعیدالظفر خان بہادر، بھوپال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نواب موصوف نے اسے پیرزادگان مارہرہ شریف کے کتب خانے سے حاصل کیا تھا۔

ایرانی و ترکی خطوط: آغاز کتابت سے خط نسخ تک کی تاریخ تمام ہوئی، اب ہم ایران یا گلستان عجم کے باب خطوط میں داخل ہوتے ہیں، یہ سیر بھی بڑی ہی دلچسپ ہے۔

ایران کی تاریخ دراصل کیومرث سے شروع ہوتی ہے جسے ایرانی یا رز دشتی اپنے ملک کا باوا آدم تصور کرتے ہیں، زردشت کی مذہبی کتاب 'اوستاء، میں ایران کا تلفظ 'اے ریانہ' ہے یہ ایرئینز کا ملک تھا جسے سنسکرت کے قدیم لب ولہجہ میں 'آریا' کہا جاتا ہے، اہل عرب کو اپنے علوم اور زبان‌دانی کا بڑا پندار تھا اس لئے وہ ایران کو عجم کہا کرتے تھے ایرانی مورخین نے تاریخ ایران کو آٹھ ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ لیکن ہم بلحاظ موضوع صرف چھ متعلقہ ادوار کو پیش کریں گے۔

۱۔ آشوری دور: جرمن محقق اسپیگل کی تحقیق کے مطابق مسیح سے ایک ہزار برس قبل ایران میں زبان قدیم فارسی اور پیکانی خط رائج تھا جو مصری اور چینی خط سے مشابہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصور بھی تھا۔

۲۔ میڈوی دور: (حضرت مسیح سے ۷۰۰ برس قبل) اس میں وھی قدیم زبان فارسی تھی، جو اب مفقود ھو چکی ھے اور خط پیکانی تھا۔

۳۔ قدیم ایرانی دور: (۵۰۹ سے ۳۳۰ ق۔م تک) اس عہد کا آخری بادشاہ دارائے اعظم تھا۔ جس کو سکندر اعظم یونانی نے شکست دی اور ایران کو تاخت وتاراج کیا۔ چنانچہ کوہ بے ستون اور نقش رستم کے کتبات میں ان کے کارنامے درج ھیں جو قریب پیکانی خط میں ھیں۔ زبان قدیم فارسی یا اوستائی تھی۔

۴۔ طوائف الملوکی دور: (۳۳۰ ق م سے ۲۲۶ ق م تک) اس عہد کی بدنظمی کی کیفیت شاھنامہ فردوسی میں ''اشکانیاں'' کے عنوان کے تحت زبان فارسی میں درج ھے۔ قدیم کتابت بدستور قائم رھی۔

۵۔ ساسانی دور: (۲۲۶ تا ۶۵۲ ق م) ساسانی حکومت کا بانی اردشیر تھا۔ جس نے زردشتی مذھب کو دوبارہ حیات بخشی۔ بہرام، نوشیرواں، خسرو پرویز وغیرہ نامور بادشاہ ھوئے۔ آخری بادشاہ یزدگرد $\frac{\text{۳۱ھ}}{\text{۶۵۲ء}}$ میں قتل ھوا۔ زبان متوسط

فارسی ہوگئی جو اُس وقت عرف عام میں پہلوی کہلاتی تھی۔ خط بھی پہلوی ہوگیا لیکن اس کا ماخذ شکستہ شکل میں مسماری ہی تھا۔

۴۔ اسلامی دور۔ (آغاز از عہد خلافت فاروقی)

حلقہ بگوش اسلام ہو جانے کے بعد چونکہ مذہبی احکام کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم کا لکھنا پڑھنا اور سمجھنا لازم ہو گیا تھا، اس لئے ایرانی نوشت و خواند میں عربی کا عمل و دخل بڑی تیزی سے شروع ہوا، اس کے باوجود آئیندہ ایک صدی تک پہلوی خط دوش بدوش جاری رہا۔ اس کا ثبوت رودکی کے اشعار سے ملتا ہے۔

آشوری دور سے دور ساسانیاں تک ایران کا خط مسماری تھا، اس کے بعد پہلوی ہوا۔ محققین عرب کے بقول ایران میں قبل اسلام سات قلم (جدول نمبر ۱) جاری تھے اور ان خطوط کا ضمیمہ 'زوارشن' تھا یعنی بوقت ضرورت ان خطوط میں مخصوص ہجوں سے کام لیا جاتا تھا۔ خراسان مامون الرشید کے زمانہ ہی میں علم وفن کا مرکز بن چکا تھا۔ مامون کی وفات کے بعد خاندان طاہریہ۔ دیالمہ۔ سلاجقہ۔ سامانیہ اور غزنویہ میں اوربھی قابل رشک ترقی ہوئی، یہاں تک کہ ایرانیوں کو تصنیف وتالیف میں عربوں پر سبقت حاصل ہوگئی علاوہ ازیں بغداد کے اصلاح یافتہ عربی خطوط (جدول نمبر [illegible]) جن کو ابن بواب اور یاقوت مستعصمی نے مہذب اور [illegible] تھا، وہ سب کے سب ایران میں جاری ہو گئے [illegible] حسن بن حسین بن علی فارسی نے [illegible]

میں نسخ ، رقاع ، ثلث اور توقیع کے اختلاط سے ایک جدید ایرانی قلم 'تعلیق' جاری کیا ، نیز محقق سے ایک اور قلم نکلا جو 'مطلق' کہلایا ۔

د شتی - دیوانی - فارسی : ایران کے پہلو بہ پہلو دولت عثمانیہ (ٹرکی) نے بھی ان ایرانی قلموں کو خوش آمدید کہا ۔ چنانچہ ان کے رواج پانے کے بعد اہل ٹرکی نے ان خطوط کی روشنی میں د شتی ، دیوانی اور فارسی تین قلم ایجاد کئے ، نیز ثلث اور رقاع کو بھی جاری رکھا ۔

قلم تعلیق کے اساتذہ میں نجم الدین ابوبکر راوندی ، خواجہ تاج سلیمانی اور میر عبدالحئی ھوئے ۔ آخرالذکر ابوسعید مرزا گورگانی کے دفتر انشاء میں افسر تھے ۔ اور متاخرین میں اشرف خان خوش نویس دربار اکبری تھا ۔

نستعلیق : قدرت نے اہل عجم کی سرشت میں حسن و اجتہاد کا مادہ بڑی فیاضی کے ساتھ ودیعت کیا ھے چنانچہ ایرانی خطوط سے بھی اُن کی حسن پرستی اور جدت پسندی کا اظہار ھوتا ھے ۔ انھوں نے دیکھا کہ خط نسخ کے دائرے بالکل یکساں اور حروف ناھموار ھیں یعنی دائرے گول ھونے کے بجائے ان کا نچلا سرا کچھ اس طرح چپٹا ھو جاتا ھے کہ زاویے نمودار ھونے لگتے ھیں ، لہذا انھوں نے نسخی حروف میں اپنی فطری صلاحیت سے کام لیکر نقاشی اور مصوری کی شان پیدا کی ، یعنی دائرے گول بنائے ، حروف کی نوکیں ، گردنیں اور زیرین حصہ باریک کردیا ۔ اس کا نام انھوں نے

'نستعلیق، رکھا ۔ ذرا اس ندرت حسن و خیال کو بھی دیکھئے کہ قلم کی پرکاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے لفظی ترکیب میں بھی کس قدر نفاست سے کام لیا ہے کہ نسخ اور تعلیق کے درمیان جو (خ) کی خلیج حائل تھی اسے دور کر کے باقیات میں ایک جامع اور دلربا نستعلیق باقی رکھا جس میں بلاشبہ تمام قلموں کی شان اور باریکیاں بدرجۂ اتم موجود ھیں ۔

شکستہ : نستعلیق اگرچہ سب سے حسین اور جامع خط تھا لیکن اس کی کتابت دیر طلب اور صبر آزما تھی، اس لئے تقریباً ۱۱۰۰ ھ میں مرتضیٰ قلی شاملو حاکم ہرات نے عام دفتری مراسلت کے لئے خط شکستہ جاری کیا ۔

شفیعہ : آقا کی تقلید اور پیروی میں مرتضیٰ قلی کے میر منشی 'شفیعہ' نے اپنے آقا کے خط شکستہ میں ایک حسن خاص پیدا کر کے اس کا نام شفیعہ رکھا جو اب تک حسب سابق مشہور ہے ۔

دراصل نستعلیق کتابی خط ہے جو ایران اور ھند و پاکستان وغیرہ میں جاری ہے اور مراسلت کا قلم شفیعہ ہے۔ نستعلیق کے حسن قبول اور ٹکسالی خط ھونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ھوگی کہ لفظ نستعلیق سے کئی محاورات ایجاد ھوئے جو ھمارے ادب میں رائج اور زبان زدعوام ھیں مثلاً فلاں شخص بڑاھی نستعلیق ہے یعنی بہ اعتبار اخلاق و عادات نہایت مہذب انسان ہے۔

کتابت کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ضروری ہے اول نستعلیق کے مشہور اساتذۂ ایران کا تذکرہ کیا

بعد ازاں عہد دولت مغلیہ پر ایک نظر ڈالی جائے جہاں یہ خط آخری بار پروان چڑھا اور اپنی پوری عمر کو پہونچا یعنی لاھور، اکبر آباد (آگرہ) دھلی اور لکھنؤ میں فن خطاطی کے چار مدرسے قائم ہوئے جہاں سے متعدد ماھرین فن خطاطی اور نامور شیریں قلم اور جواھر رقم پیدا ہوئے۔ انہی کی بدولت یہ فن لطیف آج تک زندہ اور تاب دار ہے۔ ایران میں نستعلیق کے حسب ذیل پانچ امام ہوئے۔

خواجہ میر علی علوی تبریزی: ان کو خط نستعلیق کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہ عہد تیمور یعنی (۸۰۴ھ / ۱۸۰۱ء) کے نامور خطاط اور خوش فکر و خوش گو شاعر تھے، ابوالفضل اپنے دیباچہ 'مرقع بادشاھی' (البم قطعات خوش نویسان ھند وایران مرتبہ بادشاہ جہانگیر) میں لکھتا ہے کہ اس نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیقی وصلیاں دیکھی تھیں۔ یہ شہادت یقیناً معتبر ہے اس لحاظ سے نستعلیق کا موجد کوئی اور تھا۔ وہ کون تھا؟ یہ ھنوز تحقیق طلب ہے۔ تاھم میر علی نستعلیق کے مصلح اول ضرور تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں مولانا غلام محمد دھلوی کے، تذکرۂ خوش نویساں، سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گو میر علی نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس قلم کے قواعد مقرر کئے اور اس کے مطابق نستعلیق کی نوک پلک میں حسن اور نزاکت پیدا کی۔ میر علیؒ کے مقلدین میں ایرانی، ھندی اور ترکی تینوں شامل ہیں۔ ان کی وصلیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ایران اور انڈیا آفس

لندن کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ میر علی ہروی ، ملا علی شیرازی اور میر علی خراسانی ان کے ہم نام و ہم عصر خطاطوں کے علاوہ سلطان علی مشہدی ان کے نامور شاگرد تھے۔

سلطان علی مشہدی: یہ نستعلیق کے امام دوم تھے۔ سلطان حسین تیموری کے عہد میں ہوئے۔ سلطان نے ان کو 'قبلتہ الکتاب' کا خطاب دیا تھا۔ متعدد کتابیں ، وصلیاں اور فن خطاطی پر ایک جامع رسالہ یادگار چھوڑا 'تاریخ تیموری' انہی کی تحریر کردہ ہے جس کی تصاویر مشہور مصور بہزاد نے تخلیق کی تھیں۔ بابر نے بھی اپنی تزک میں ان کے کمالات بیان کئے ہیں۔

سلطان علی کے شاگرد یہ ہیں:- سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور ، علاءالدین محمد ہروی، مولانا عبداللہ ہروی، زین الدین محمود ، عبدی نیشاپوری ، محمد قاسم شادی شاہ ، اور میر علی الکاتب ہروی ، ان میں آخری زیادہ ممتاز ہیں۔

میر علی الکاتب ہروی: یہ نستعلیق کے امام سوم کہلاتے ہیں۔ خطاطی کے ساتھ شاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔ مجنوں تخلص تھا۔ فن خطاطی پر دو رسالے نظم کئے جو مشہور ہیں۔ ۹۰۹ھ میں ایک رسالہ رسم الخط پر لکھکر سلطان مظفر کے نام معنون کیا۔ یہ رسالہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ جب سلطان عبدالعزیز بخارا کے درباری ہوئے تو سلطان کی فرمائش پر دو کتابیں 'گلستان سعدی' اور 'مطلع الانوار' امیر خسرو رقم کیں۔ 'گلستان' پیرس کی لائبریری میں اور 'مطلع الانوار' خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

ابوالفضل نے بھی ان کو نستعلیق کا استاد تسلیم کیا ہے۔ 'مرقع بادشاہی' (جہانگیر) میں بھی ان کی چند وصلیاں شامل ہیں۔ زیادہ معتبر روایت کے بموجب ۱۰۵۷ھ میں وفات پائی۔

میر علی کے بعد نستعلیق کے مشہور خطاطوں میں ملا محمد حسین تبریزی ، میر سید احمد مشہدی ، ملا حسن علی مشہدی ، ملا شاہ محمد نیشا پوری اور مرزا ابراھیم اصفہانی ہوئے جن کا مرتبہ جدا جدا ہے۔

میرعمادالحسینی قزوینی : نستعلیق کے امام چہارم ہیں۔ ان کو باباشاہ اصفہانی سے تلمذ حاصل تھا اور ملا محمد حسین تبریزی اور سلطان علی مشہدی کے مقلد تھے۔ شاہ عباس صفوی کے دربار سے متعلق تھے۔ ان کے متعلق ایک روایت اس طرح مشہور ہے کہ جب ان سے شاہ عباس نے 'شاہ نامہ فردوسی' نقل کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے اپنے لئے ایک آراستہ باغ مخصوص کرایا جس کے حوض میں شاھی خرچ سے عرق گلاب اور کیوڑہ بھرا گیا۔ یہ وقتاً فوقتاً تبدیل بھی ہوتا تھا، اس اہتمام اور تکلف کے ساتھ میر عماد نے تین سال کی مدت میں صرف چھ جزو مکمل کئے۔ حاسد وزراء اور اُمراء عماد کی تاک میں تھے، انہوں نے موقع پا کر شاہ کو بھڑکایا اور کہا کہ تین سال میں چھ لاکھ روپے کی رقم خطیر خرچ ہوچکی ہے اور ابھی صرف چھ جزو لکھے گئے ہیں۔ حواشی پر ابھی طلائی کام بھی نامکمل ہے۔ بادشاہ ان خوشامدیوں کی باتوں میں آکر غضبناک ہوا اور میر عماد کو حکم دیا کہ نصف یوم میں چھ لاکھ روپیہ واپس خزانۂ شاھی میں داخل

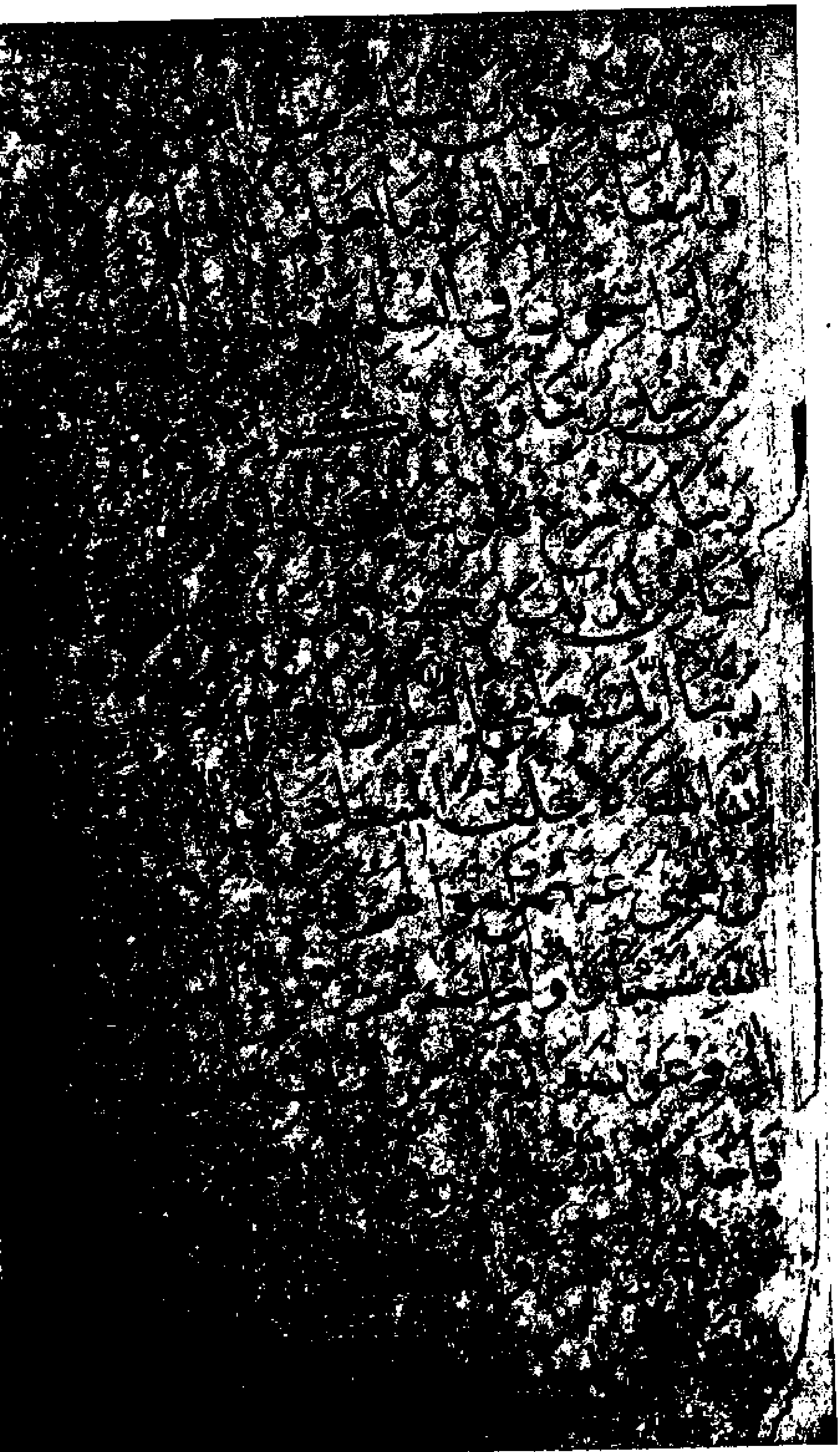
کیا جائے ۔ میر عماد امر اچانک عتابِ شاھی سے متأسف تو ضرور ھوئے لیکن اسی وقت چند نقیبوں کے ھمراہ ایک سواری میں بیٹھ کر شہر گئے ۔ نقیبوں نے صدا بلند کی "امروز تحریر عماد ارزان است"، چند ھی گھنٹوں میں وہ چھ جزو مقراض زدہ ھوکر ایک ایک دو دو سطروں کی شکل میں ھاتھوں ھاتھ فروخت ھوگئے ۔ مقررہ وقت سے قبل چھ لاکھ روپیہ خزانۂ شاھی میں جمع ھوگیا ۔ بادشاہ یہ اطلاع پاکر اور بھی برافروختہ ھوا ۔ بعد میں اپنی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے آس نے میر عماد کو ایک حمام میں قتل کرادیا ۔ اس وقت آسکی عمر ۶۳ سال کی تھی ۔ سال وفات ۱۰۲۴ھ م ۱۶۱۵ء ہے جو عہد جہانگیر تھا ۔ شہنشاہ جہانگیر نے جبھی یہ درد ناک واقعہ سنا تو رو پڑا اور کہا کہ اگر شاہ عباس آسکو قتل کرنیکی بجائے میرے پاس بھیج دیتا تو میں شاہ کو عماد کے ھم وزن موتی بھیج دیتا ۔

آقا عبدالرشید ویلمی :

میر عماد کے حقیقی بھانجے داماد اور شاگرد تھے ، آقا رشید کے نام سے مشہور ھوئے اپنے فن میں اتنے کامل تھے کہ استاد و شاگرد کی وصلیوں میں امتیاز دشوار تھا ۔ میر عماد کے واقعۂ شہادت اور اپنے قتل کے اندیشہ سے ایران سے راہ فرار اختیار کی ھندوستان تک پورا سفر گھوڑے پر کیا ۔ بحالت تباہ شاھجہان کے حضور میں اکبر آباد (آگرہ ، بھارت) آئے ۔ بعض مورخوں کا خیال ہے اول لاھور پہونچے اور کچھ مدت وھیں قیام کیا ۔ اور میں وھاں آن کے متعدد شاگرد ھوئے ۔ اگر یہ واقعہ ہے تو نستعلیق کا پہلا مرکز لاھور کو تسلیم کرنا ...



وصلی : میر عماد (عہد شاہ جہانی)



قلم : یاقوت رقم اول
(عبدالباقی حداد)

آگرے پہونچتے پہونچتے لباس وجامہ زبوں اور تار تار ہو چکا تھا اور یہ زبوں حالی باریابی میں مانع ہو رہی تھی ۔ نذر شاہی کے لئے بھی کچھہ درکار تھا ۔ آقا رشید نے قدرے غور وتامل کے بعد قلم و دوات طلب کی اور ایک قطعۂ کاغذ پر یہ اشعار لکھے ۔

آیا خجستہ خصالے کہ ساکنان فلک
بر آستان تو دارند میل دربانی
چہ حاجت است کہ گوئیم حال خستۂ خود
کہ حال خستہ دلاں را توخوب می دانی

یہ پرزہ کاغذ آقا رشید کے حق میں سچ مچ کاغذی پیرھن ثابت ھوا ، جب یہ پیکر تصویر غم بادشاہ کے رو برو حاضر ھوا تو شوخئی تحریر خود منہ سے بول اٹھی، نقش خود فریادی بن گیا ۔ شاہ جہاں نے آقا رشید کو دربار میں داخل کیا ، داراشکوہ کی اتالیقی بخشی اور پندرہ سو روپے ماھوار مشاھرہ مقرر کیا ۔ بعد میں خدمت بیوتات سپرد ھوئی ۔ گردش ردو ھوئی ، امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ رھنے لگے ۔ آگرے میں کئی شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کرائے ، آخر دم تک شغل کتابت جاری رھا ، شاگردوں کی تعداد میں برا بر اضافہ ھوتا رھا یہاں تک کہ ھند و پاکستان کے چاروں دارالسلطنتوں ، لاھور، آگرہ ، دھلی ، اور لکھنؤ ، میں اس کے چار مدرسے قائم ھوئے ، اُن کی وصلیاں جواھر کے مول فروخت ھوتی تھیں ۔ ۱۰۸۱ھ میں بمقام آگرہ بعہد عالمگیر وفات پائی ۔

دولت مغلیہ میں علم الخط کی ترقی: یہ تھی ایران اور ترکی میں خطاطی کی نشو و نما کی مختصر روداد۔ اس کے بعد امیر تیمور کا ستارہ چمکا اور نہ صرف ایران بلکہ برصغیر ہند و پاک کی قسمت بھی اسی خاندان کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ یہ خاندان خود ہی صاحب ذوق نہیں بلکہ اہل کمال کا بھی بے حد قدردان تھا، اس لئے اس کے زیر سایہ علوم و فنون کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ بالخصوص برصغیر و ہند و پاک میں خاندان مغلیہ نے ہنرپروری اور مردم نوازی کی ایسی روایات قائم کیں جنکی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دربار مغلیہ ہر قسم کے اہل کمال کا مرجع و مآب بن گیا جن میں خطاطی کے ماہرین بھی شامل تھے۔ ان ماہرین خطاطی کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا یہاں تک کہ اس خاندان کے آخری چشم و چراغ، بہادر شاہ ظفر خود اس فن میں طاق تھے۔ ان ماہرین فن کے کمالات کی داستان خاصی طویل ہے پھر بھی ہم اختصار کے ساتھ اس دلچسپ و دلاویز فن کے ارتقا اور گونا گوں مظاہر پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دربار مغلیہ کے ارباب ہنر نے اس میں کیا کچھ نوک پلک پیدا کی اور اسے کس طرح درجۂ کمال تک پہونچایا۔

امیر تیمور: (۷۷۱ - ۸۰۷ھ) امیر تیمور کے عہد کا بیشتر حصہ قتل و غارت گری میں گزرا پھر بھی فارسی علم و ادب کو کافی عروج حاصل ہوا۔ میر علی تبریزی نے اسی کے زمانے میں شہرت پائی۔ امیر کے چاروں فرزند——— جہانگیر

سلطان ، عمر شیخ سلطان ، میران شاہ گورگانی اور مرزا شاہ رخ ـــــ شاعر ھونے کے علاوہ بہترین خطاط تھے ۔ یہ جوہر انکی اولاد در اولاد برابر منتقل ھوتا رہا ۔ چنانچہ شہزادہ بایسنقر بن شاہ رخ مرزا ، شش قلم ھوئے ۔ ان کے کتب خانہ میں جعفر تبریزی تلمیذ میر علی تبریزی کے ماتحت چالیس خطاط کلام مجید اور قلمی کتب لکھنے پر مامور تھے ۔ سکندر مرزا ابن عمر شیخ کے دربار میں مولانا معروف بغدادی مشہور خطاط تھے ۔ اُن کے قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ جب موج میں آئے اور قلم اٹھاتے تو صبح سے شام تک کی چند ساعتوں میں ڈیڑھ ھزار بیت لکھ ڈالتے ۔

بابر : (۹۳۲ - ۹۳۷ ھ) کے عہد میں ھندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کی کیا حالت تھی اُس کی تمام کیفیت تزک بابری میں موجود ھے ۔ اس لحاظ سے بابری عہد میں شاھی دفاتر کی جو تنظیم ھوئی وہ بابر ھی کا کرشمۂ کار تھا ۔ خود بابر خط بابری کا موجد تھا ۔ اس خط کے مشہور استاد میر عبدالحئی مشہدی اکبر آبادی بعہد ھمایوں تھے بابر کا سلسلہ تلمذ میر علیؔ تبریزی سے ملتا ھے ۔

ھمایوں : (۹۳۷ - ۹۶۳ ھ) بابر نے اپنے عہد میں فن خطاطی کی جو داغ بیل ڈالی تھی ھمایوں نے اُسکی معقول نشو و نما کی لیکن عمر اور زمانے نے اسکا ساتھ نہ دیا ۔ عبدالحئی کے علاوہ عہد ھمایوں کے مشہور خطاط خواجہ سلطان علی تھے جنکو اکبر نے اپنے زمانے میں افضل خاں کے خطاب سے سرفراز کیا ۔ خواجہ عبدالصمد بھی عہد ھمایوں کے خطاط تھے

لیکن یہ دور اکبری میں چمکے - بزم خطاطان میں اب تک صرف بادشاہوں اور شہزادوں نے شہرت اور مرتبہ پایا تھا لیکن مخدرات تیموریہ نے جو علم وادب کا بلند ذوق رکھتی تھیں ابھی تک اس فن لطیف میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا، یہ بھی عہد ہمایونی کی برکت تھی کہ ملکہ گلبدن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'ہمایوں نامہ' کے ساتھ ساتھ خطاطی کی طرف بھی توجہ دی اور اس میں کمال حاصل کیا - گلبدن کی تقلید میں نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النسا مخفی نے بھی اپنے تخیلات سے ادب کو، اور خطاطی سے علم خط کو زینت اور فروغ بخشا -

اکبر: (۹۶۳-۱۰۰۴ھ) اکبر کا عہد حکومت بلحاظ سلطنت اور باعتبار علوم و فنون ایک زرین عہد متصور ہوتا ہے - ابوالفضل کی بیش بہا تصانیف بالخصوص آئین اکبری میں اس عہد کی تمام ترقیات کی تفصیل نہایت شرح و بست کے ساتھ موجود ہے -

خواجہ عبدالصمد شرین قلم: خواجہ نظام، وزیر شاہ شجاع شیرازی کے فرزند تھے - خطاط ہونے کے علاوہ مصور اور شاعر بھی تھے - اول ہمایوں کے درباری ہوئے - اکبری عہد میں منصب چہار صدی پایا - اور فتح پور سیکری کی ٹکسال کے ناظم مقرر ہوئے - خشخاش کے ایک دانے پر سورہ اخلاص لکھ کر اکبر کو پیش کی -

محمد حسین کشمیری زرین رقم: کامل نستعلیق تھے - اکبر کی فرمائش پر آئین اکبری کا پورا نسخہ تحریر کیا

تصاویر دوسرے مصوروں نے بنائیں ۔

راجہ ٹوڈر مل کھتری: اکبر کے مشہور رتن اور دیوان اعلیٰ، نہایت ہی زود نگار اور خوش نویس تھے میر فتح اللہ کے مشورہ سے قانون بندوبست اراضی مرتب کیا جو آج بھی کم و بیش ہند و پاک میں رائج ہے ۔ اس نسخہ پر صرف شاہی سے تین لاکھ روپیہ صرف ہوا ۔ یہ نسخہ پہلے آجین میں تھا، اب لندن میں ہے ۱۰۲۰ ھ میں وفات پائی ۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں: بیرم خان کے فرزند رشید تھے ۔ ہندی کے مشہور و معروف شاعر، نستعلیق اور ہندی خوشخطی میں کمال حاصل تھا، ان کے ہندی دوہے بہت مشہور ہیں ۔

مرزا ایرج اور مرزا داراب: دونوں خان خاناں کے فرزند تھے ۔ مرزا ایرج نسخ اور تعلیق اور مرزا داراب محض نستعلیق نگار تھے ۔ دونوں بھائیوں کا مشترکہ نمونۂ قلم ہفت بند کاشی ہے ۔

مرزا عزیز کوکاتاش: جلال الدین اکبر کے رضاعی بھائی، کامل خوش نویس اور باکمال مصور تھے ۔

ملا عبدالقادر اخوند: فن خطاطی میں ان کو اکبر بادشاہ کی استادی کا فخر حاصل تھا اور مختلف خطوط کے ماہر تھے ۔

عبدالرحیم، عنبریں رقم: ہرات سے ہندوستان آکر خان خاناں کے منظور نظر ہوئے کتب خانۂ خان خاناں میں

کتب نویسی پر مامور ہوئے ۔ اکبر کو خمسہ نظامی لکھ کر پیش کیا، جو اس وقت لندن میں ہے ۔ بادشاہ سے عنبریں رقم کا خطاب پایا ہے ۔

میر معصوم قندھاریؒ: والد کا نام سید صفائی تھا۔ آبائی وصف صفائی اُن کے اُن کتبات سے ظاھر ہوتا ہے جو قلعہ آگرہ اور فتح پور سیکری کی اکثر عمارات پر کندہ ہیں ۔

حسین بن احمد چشتی: بلند دروازہ فتح پور سیکری کے پیش طاق کا عربی کتبہ انہی کے کمال کی یادگار ہے۔

پنڈت جگن ناتھ: اکبری عہد کے پہلے کاتب ہیں جنھوں نے ہندی قلموں کو شان اور عروج بخشا ۔

ملا علی احمد مہر کن: خط کی جملہ اقسام بالخصوص تعلیق اور نستعلیق کے بہترین خطاط اور حکاک تھے ۔ فولاد پر مہریں کندہ کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا ۔

مذکورہ بالا خطاطوں کے علاوہ محمد اصغر عرف اشرف خاں، ہفت قلم، علامہ میر فتح اللہ شیرازی، مظفر علی، خنجر بیگ چغتائی - رائے منوھر، محمد یوسف کابلی اور خواجہ ابراھیم حسین وغیرہ خطاط بھی دربار اکبری سے منسلک تھے ۔

جہانگیر: (۱۰۳۶-۱۰۱۴ھ) جہانگیر شعر و شراب اور نغمہ و رباب کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصوری اور خطاطی سے بھی عشق رکھتا تھا۔ اس کے دربار میں بھی متعدد نامور خطاط موجود تھے ۔

مرزا محمد حسین ابن مرزا شکر اللہ : ثلث تعلیق اور نستعلیق کے استاد اور خط شکستہ کے موجد تھے ۔ عہد ہمایوں میں آئے ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی ۔

شہزادہ خسرو اور شہزادہ سلطان پرویز : دونوں جہانگیر کے چشم و چراغ تھے ۔ اول الذکر خطاط ہونے کے علاوہ فن انشاء کے بھی ماہر تھے ۔ شہزادہ پرویز آخر عمر تک کلام اللہ لکھتے رہے ۔

محمود بن اسحاق سہائق الہروی : نستعلیق کے استاد تھے ۔ دیوان کامران لکھا جو پٹنہ (بھارت) کی لائبریری میں موجود ہے ۔ اس دیوان پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دستخط ثبت ہیں ۔

احمد علی ارشد : عہد جہانگیری کے مشہور طغرا نویس تھے ، بلند دروازہ فتح پور سیکری کے ایک طغرے میں پنج تن پاک اور خلفائے راشدین رض کے اسماء گرامی کندہ ہیں ۔

خواجہ محمد شریف ابن خواجہ عبدالصمد شیریں قلم : عربی فارسی کے جید عالم اور نستعلیق کے کامل استاد تھے ۔ دربار اکبری سے رخصت ہو کر شہزادہ جہانگیر کی خدمت میں آئے اور امیرالامراء کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی خطاطوں نے اس عہد کو زینت بخشی ۔

شاہ جہاں : (۱۰۲۶ - ۱۰۳۶ھ) یہ نامور بادشاہ جو سلاطین مغلیہ میں علوم و فنون کا سب سے زیادہ قدردان اور

سر پرست تھا، بزم خطاطان میں خود بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا خط نستعلیق کا ماہر تھا، خط شکستہ بھی عہد شاہ جہانی کی یاد گار ہے جسکی توسیع اور اشاعت کا سہرا شاہ جہاں کے لائق وزیر سعداللہ خان کے سر ہے ۔ شہزادہ دارا شکوہ بھی نہایت خوش رقم خطاط تھا ۔ دارا شکوہ کی ایک قلمی وصلی لال قلعہ دھلی کے عجائب خانہ میں موجود ہے جس پر یہ اشعار درج ہیں :-

اے فراق تو یار دیرینہ ۔ غم تو غمگسار دیرینہ
درد تو مہمان ہر روز ۔ داغ تو یادگار دیرینہ

عبدالحق عرف امانت خاں شیرازی : علامی افضل خاں، وزیر شاھجہاں کے بھائی تھے ۔ روضۂ تاج محل کے تمام طغرے اور دیگر کتبات بھی اسی ماھر فن کے کمالات کا نمونہ ہیں ۔ بالخصوص شاہ جہاں اور ممتاز محل کے مزارات کے طغرے اپنی نظیر آپ ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی با کمال خوش نویسوں نے تاج کے کتبات لکھنے میں حصہ لیا ۔ مثلاً ۔ ستار خاں رومی ۔ محمد خان بغدادی ۔ وھاب خان ایرانی ۔ روشن خان شامی ۔ قادر زماں کابلی اور عبدالغفار خان ملتانی ۔

عبدالباقی حداد : عبداللہ کے نام سے مشہور تھے ۔ شاہ جہاں نے ان کو عالمگیر کا استاد مقرر کیا تھا ۔ نسخ کے ماھر تھے ۔ اس ماھر فن نے دو قرآن مجید لکھے ایک تیس ورقی اور دوسرا چوب قلم ۔ دونوں شاہ جہاں کی نذر کئے اور یاقوت رقم (اول) کا خطاب پایا ۔ اس فاضل روزگار کے چند اوراق قرآن مجید راقم الحروف کے پاس ہیں ان میں سے ایک ورق



وصلی : داراشکوہ



خطاط: احمد بن محمد الحجی (قیاساً ۱۱۰ء)
اس تحریر کے دنیا میں صرف تین نسخے [illegible]

کا عکس ھدیۂ ناظرین کیا جارھا ھے۔ اس نا.ور خطاط نے ھندوستان میں اپنے کئی شاگرد چھوڑے جو یاقوت رقمی اور یاقوت خانی کے خطابات سے ممتاز ھوئے، اُن میں سے دو بہت مشہور ھوئے:—

محمد عارف یاقوت رقم خان: شاگرد رشید حداد، نسخ و ثلث کے استاد، اُن کے ایک قلمی قرآن مجید کا عکس بھوپال سے شائع ھوچکا ھے۔ محمد معظم شاہ کے عہد میں وفات پائی ان کے بھانجے نے بھی یاقوت رقم کا خطاب پایا۔ دونوں حداد کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ میر محمد کاظم۔ مولانا حشمت‌اللہ۔ محمد افضل۔ محمد عسکری۔ ملا باقر کشمیری۔ مقصود علی، میر محمد کاشی وغیرہ استاد شاھجانی دربار سے منسلک تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر: (١٠٦٩-١١١٨ھ) عالمگیر بھی ماھر فن خطاط تھے۔ حداد کے بعد سید علی خاں حسینی بن آقا مقیم تبریزی کے شاگرد ھوئے۔ خط نسخ اور تعلیق میں متعدد کلام مجید لکھے جو انکی یادگار ھیں۔ مرحوم خواجہ حسن نظامی دھلوی نے بھی اُن کا ایک عکسی قرآن مجید شائع کیا تھا جو شائد اب بھی ملتا ھے۔ ماہ نو کراچی کی وساطت سے ھمیں عالمگیر کے نوشتہ قرآن مجید کے ایک ورق کا عکس حاصل ھوا جو زینت مقالہ ھے۔

سید علی خاں حسینی جواھر رقم: میر عماد اور آقا رشید دیلمی کے ندیم خاص اور مقلد تھے۔ ھمہ اوقات عالمگیر کی

خدمت میں حاضر رہتے ۔ قیام دھلی کے زمانہ میں شاھی کتب خانہ میں کام کیا ۔ ۱۰۹۴ھ میں وفات پائی ۔ شمس الدین علیخاں بھی جواھر رقم ھوئے ۔

سید محمد باقر: بادشاہ کو ان کا خط بہت پسند تھا ۔ خطوط عالمگیری میں آنؒ کے خط کی جابجا تعریف موجود ھے، بعض شاھزادے بھی آن کے شاگرد ھوئے ۔

مرزا جعفر: خط شکستہ کے استاد تھے ۔ عالم گیر نے کفایت خان کا خطاب عنایت کیا تھا ان کے علاوہ اور بھی ھندو اور مسلمان نامور خطاط تھے جنھوں نے اس فن کو اوج کمال تک پہنچایا ۔ مثلاً کشمیری پنڈتوں اور کائیستوں میں پنڈت لچھمی رام، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ وغیرہ، دلی، لکھنؤ اور آگرے میں رھتے تھے ۔

محمد فرخ سیر: (۱۱۲۴ - ۱۱۳۱ھ) اس عھد میں عھد عالمگیری کے خطاطوں کے علاوہ حاجی ناھدار خان (استادِ شھزادگان) آقا رشید ویلمی کے مقلد اور استاد مرزا حاتم بیگ معظم شاہ میر منشی تھے ۔ مرزا صاحب نے فن انشاء پر بھی ایک کتاب لکھی ھے ۔

ناصرالدین محمد شاہ: (۱۱۳۱ - ۱۱٦۱ھ) کے پر آشوب زمانے میں یہ مشہور خطاط ھوئے ۔

۱ ۔ محمد افضل لاھوری، قادری، کامل فن ھونیکے باعث عبدالرشید ویلمی ثانی مشہور تھے ۔

۲ ۔ مولوی حیات علی شاگرد رائے پریم ناتھ، استاد خط شکستہ، آثار الصنادید میں ان کا ذکر موجود ھے ۔

۳ ۔ نواب مظہر خان المخاطب بہ ظفر خان ، نواب روشن الدولہ کے صاحبزادے خط شکستہ کے استاد تھے ۔

۴ ۔ میر محمد موسیٰ سرهندی ملازم دربار شاهی ، میر عماد کے پیرو تھے ۔

شاہ عالم : (۱۰۲۱ - ۱۱۷۳ ھ) کے عہد میں مشہور ماهر نسخ قاضی عصمت اللہ خاں هوئے جن کے متعدد شاگرد تھے ۔ ان میں میر محمدی زیادہ مشہور هوئے ۔ محمد میر جو میر سوز کے نام سے مشہور هوئے شاعری کے علاوہ خط شفیعہ اور نستعلیق کے استاد تھے ، درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ بلا کر اپنا استاد بنالیا ۔

محمد اکبر شاہ ثانی : (۱۲۵۲ - ۱۲۲۱ ھ) مولانا غلام محمد راقم دهلوی ۔ هفت قلم ، حکیم قدرت اللہ خاں کے شاگرد، نسخ ، نستعلیق ، تعلیق ، ثلث ، شکستہ ، شفیعہ اور ریحان کے ماهر تھے ۔ فارسی میں بر صغیر هند وپاک کے مشہور خطاطان کا ایک قابل قدر تذکرہ لکھا ھے جسے سر ولیم جونس اور مولوی هدایت حسین نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا ۔ ان کے علاوہ مولائی ، حافظ بقاء اللہ معلم قلعہ معلیٰ ، میر ابوالحسن خوش نویس درباری وغیرہ اس عہد کے مشہور خطاط گزرے هیں ۔

عالمگیر ثانی : (۱۱۶۷ ھ) اس عہد کے مشہور ومعروف خطاط عمادالملک غازی الدین خاں فیروز جنگ تھے ، هفت زبان شاعر اور هفت قلم خطاط تھے ۔ نستعلیق مرزا محمد علی

کی طرز پر اور نسخ یاقوت رقم کے انداز پر لکھتے تھے عام
مراسلت شفیعہ میں کرتے تھے - ۱۲۰۰ھ میں بمقام کالپی
وفات پائی - دوسرے خوش نویس مرزا ارجمند تھے، شفیعہ
مختلف انداز میں لکھتے تھے، مصور بھی تھے، غازی
الدین خاں کے ملازم تھے -

ابوظفر بہادر شاہ: (۱۲۰۳-۱۲۷۴ھ) سلاطین مغلیہ کے
آخری تاجدار تھے، گو اپنے اسلاف کے ایک قابل فرزند اور لائق
جانشین تھے لیکن گردش فلک اور انقلاب دوراں کے ہاتھوں شاہ
شطرنج ہوکر رہ گئے تھے، شاہ عالم کے عہد میں شاہ عالم کی
حکومت از دھلی تا پالم رہ گئی تھی وہ اب گھٹتے گھٹتے اور سمٹتے
سمٹتے بہادر شاہ کے حق میں صرف لال قلعہ کی چار دیواری
میں محدود ہوکر رہ گئی تھی - بخت کی نارسائی اور حالات
کی ناسازگاری نے بادشاہ کو جس منزل پر پہنچایا، اس کا
اور اسکی اولاد کا جو حشر ہوا وہ ایک ایسا واقعۂ دلدوز اور
سانحہ روح فرسا ہے جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا - ایسے
ناگفتہ بہ حالات اور کوائف میں علوم و فنون کی کیا ترقی
ہوتی - اس لحاظ سے یہ صرف بہادر شاہ ھی کا اعجاز شاہانہ
اسکی علم دوستی اور ادب پروری ھی تھی کہ اس کے جیتے جی
علوم وفنون پامال اور برباد نہیں ہوئے، ان کی وہ درگت
نہ ہوئی جو ایسے ماحول میں متوقع تھی - بہادر شاہ
حیثیت ایک پنشن خوار شخصیت سے زیادہ نہ تھی لیکن
بے زری اور کوتاہ دستی کے باوجود اس نے بے جگر
دریا دلی سے کام لیا - اپنے ھی قلیل صرف خاص سے ...

کی حتی المقدور سر پرستی اور قدردانی کی ، کسی کو بھوکا اور فاقہ کش نہ ہونے دیا ۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اسی چار دیواری کے اندر کبھی دیوان عام میں جلوۂ عام اور کبھی دیوان خاص میں مجرائے خاص ہوتا تھا ۔ دربار میں علماء فضلاء ادباء ، شعراء ، اهل فن اور اهل هنر باریاب اور عطیات خسروانہ سے فیض یاب ہوتے ۔ مذہبی مجالس ، ادبی محافل اور جلسہ ہائے موسیقی سے غذائے روحانی پاتے ۔

عید ، بقرعید اور عام دنوں میں جمعہ کے جمعہ جب جامع مسجد کے فلک بوس میناروں سے کعبہ کی دلربا اذان بلند ہوتی تو لال حویلی سے یہی شہریار اجڑے دیار کی شاھجہانی مسجد کا رخ کرتا ۔ کڑکتیوں کی کڑکتی ہوئی صداؤں ـــــ با ادب با ملاحظہ ! ہشیار نگاہ رو بروا ! بادشاہ سلامت جہاں پناہ ! ! ! ـــــ کے درمیان سواری بادبہاری زر و جواھر بکھیرتی مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچتی ، یہ سیڑھیاں بھی جو بادشاہ کے دم قدم سے ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھیں شاہ کے قدم پا کر اور گرم ہو جاتی ۔ مسجد کے گرد و نواح کا بازار گل گلزار اور چوک سراپا بہار بن جاتا کبھی سر شام زینت محل جاتے تو چاندنی چوک میں چاند نکلنے سے پہلے چاندنی کھل جاتی ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر قربان ہونے لگتے ۔ جمنا شاہ کو جھروکوں میں دیکھکر روزانہ صبح شام ... کیا کرتی تھی ، اس چوپڑ والی نہر کے نصیب جاگتے ... شب بدر اور کہاں کا چاند ، رخ شاھی کا عکس پاتے ... میں مد و جذر آجاتا ۔ بیقرار لہریں فلک کو آئینہ ... لگتیں ۔

عرس، تیج، تہوار، میلوں ٹھیلوں اور سیر گل فروشان کی نوبتوں پر نواح شہر میں بستی حضرت نظام الدین محبوب الٰہی اور حضور خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کا موضع مہرولی چند دنوں کے لئے دوسرا شاہ جہاں آباد بن جاتا ۔ کیا کیا مناؤں اور کہاں تک روؤں آس گئے گذرے وقت میں بھی کیا کچھ نہ تھا ۔ کون تھا ؟ جس نے اس بزم آخر کا تماشا نہیں دیکھا ۔ دیکھنے والی آنکھوں نے وہ بھی دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ جب وقت پڑا اور بادشاہ بے بس اور لاچار ہوگیا تو رو پڑا، ساری رعایا رو پڑی، شاہ و ملکہ دونوں روتے ہوئے، سب کو روتا چھوڑ کر "مغلستان" دلی کے زمین و زمان اور مکین و مکان سے منہ موڑ کر رنگون رخصت ہوئے ۔ سچ پچ ہم سے زیادہ رنگون خوش قسمت ہے کہ ہمارا یہ آخری متاع دل و جاں، نشان عزت و اماں اسکو نصیب ہوا ۔ آہ ! جملہ معترضہ کے طور پر یہ ایک آہ تھی جو بیساختہ دل سے نکل گئی ۔

گلزار خطوط میں بہادر شاہ نے جو قلمیں لگائیں اور آن سے جو گل و بوٹے کھلے آن میں سے بہت سے باد سموم کے جھونکوں سے مرجھا گئے جو باقی ہیں وہ آسکی زندہ بہار اور ابدی یادگار ہیں ۔

بہادر شاہ خود ایک ماہر خطاط، استاد نسخ و نستعلیق تھے ۔ دلی میں آن کا شاہی زینت محل، حکیم احسن اللہ خان طبیب شاہی کی حویلی اور درگاہ حضرت صابر چشتی کے کتبات آن کی خطاطی کی منہ بولتی تصاویر ہیں ۔ شہزادوں کو خود اصلاح دیا کرتے تھے ۔ ان کے عہد کے مشہور خطاط یہ تھے :

بدر الدین عَلی خاں مرصع رقم : یہ بدر کامل اور شہر یار قلم اپنے نانا شیخ محمد یار کا شاگرد، آقا عبدالرشید ویلمی کا مقلد، نسخ، نستعلیق، ھندی اور انگریزی خطوط کا ماھر، اپنے وقت کا سب سے بڑا حکاک تھا - شاھی مواھیر کے علاوہ تمام وزراء امراء اپنی مہریں اسی سے تیار کراتے تھے - مرزا غالب کی تاریخی مہریں بھی اسی یگانۂ روزگار کی یادگار ھیں - مرحوم نے اپنی وصلیوں اور تمام مہروں کا ایک البم مرتب کیا تھا لیکن اُنکی اولاد ان کی اس یادگار کو محفوظ نہ رکھ سکی - ھمارے پاس ھمارے دادا سید محمد شاھی امام مرحوم جامع مسجد دھلی کی ایک انگوٹھی ھے - اس کے عقیق پر بدرالدین نے اُن کا نام اور سن کندہ کیا تھا - ان کے علاوہ سید منور علی شاگرد میر پنجہ کش، استاد نسخ و نستعلیق اور دوسرے سید حسین علی مشہور خوش نویس اور حکاک گزرے ھیں -

سید محمد امیر رضوی : (پنجہ کش) : میر صاحب پنجہ کشی، بانک، خطاطی، مصوری، نقاشی، جدول نگاری، صحافی، علاقہ بندی، سنگ تراشی، کون سا فن تھا جس کے وہ ماھر نہ تھے - مولانا غلام محمد دھلوی اپنے تذکرۂ خطاطان میں لکھتے ھیں کہ میں نے اُن کے یہ جوھر دیکھکر اُن کو آغا رشید ویلمی کی چند وصلیاں دیں اور کہا کہ وہ اس خط کی مشق کریں - میر صاحب نے اس مشق کو ایسے کمال پر پہنچایا کہ آقائے ثانی بن گئے - سید اور آقا کی وصلیوں میں شناخت نا ممکن ھوگئی - ماہ محرم میں میر صاحب

، آقا رشید کا عرس کرتے تھے ، فاتحہ خوانی کے بعد علم الخط کی اصلاح اور ترقی کیلئے اساتذہ فن کے درمیان باهم تبادلۂ خیال هوتا تھا۔راجہ الور کی فرمائش پر سترہ سال کی مدت میں گلستان سعدی کا نسخہ مکمل کیا ۔ یہ آج تک الور میں موجود ہے ، اس وقت اسکی قیمت ایک لاکھ سے بھی زائد ہے ۔ اُن کا مکان محلہ پہاڑی املی پر تھا ۔ چھت کی کڑیوں پر میر صاحب نے "یا فتاح اور بسم اللہ شریف" لکھی تھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی میں گولی کھا کر شہید ہوئے ۔ میر صاحب کے تین شاگرد بہت مشہور ہوئے :

آغا مرزا ، دهلوی : میر صاحب کے شاگرد رشید ، ماهر نستعلیق ، انہوں نے بھی گلستاں لکھی اور آسے مصور کیا ۔ میر صاحب کے هم پلہ اور اپنے وقت کے استاد ہوئے اپنے بعد رحیم اللہ اور میر مدد علی الوری کو اپنا شاگرد اور جانشین چھوڑا ۔

مرزا عباداللہ بیگ ابن مرزا عبداللہ بیگ : بچپن هی سے میر صاحب کے سامنے زانوئے ادب طے کیا اس لئے آغا مرزا پر سبقت لے گئے ۔ زمرد رقم کا خطاب پایا ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پٹیالہ میں مامور ہو گئے ، آنکی اولاد میں مرزا محمود نے خوش نویسی میں مہارت حاصل کی اور اس فن پر ایک کتاب لکھی ۔

حافظ سید امیرالدین : میر صاحب کے شاگرد سوم هیں ، آن کو بھی نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل تھا هم نے آنکی دو وصلیاں پاکستان کے عجائب خانہ میں داخل کی هیں ۔

سید حامد ابن سید محمد امام جامع مسجد دھلی :
راقم الحروف کے والد ماجد ، سید امیرالدین کے شاگرد خط نسخ کے ماھر تھے ، ان کی خطاطی کا نمونہ قرآن مجید کا ایک ورق زینت کتاب ھے ۔

منشی ممتاز علی : حضرت بہادر شاہ کے تلمیذ یافتہ ، دور جدید میں موئی مٹی کی نشانی ، اردو بازار دھلی کے مایۂ ناز اُستاد نسخ و نستعلیق تھے ۔ ھم نے بھی اپنے لڑکپن میں انھیں دیکھا تھا ۔ جب آپ حجاز گئے تو خانۂ کعبہ کے پردے پر آپکو خطاطی کی دعوت دی گئی قرآن مجید ، دیگر کتبات اور طغرے آج بھی آپکی یاد گار ھیں ۔ متعدد شاگرد چھوڑے اُن کے صاجزادگان منشی مشتاق علی اور منشی عبدالغنی اُن کے جانشین ھوئے ۔

محمد جان فرزند میاں محمد عاشوری : میر کان کے شاگرد تھے ۔ بزمانۂ ولیعہدی ابوظفر کی سرکار میں ملازم تھے ۔

میر جلال الدین ابن امام علی : اپنے والد کے شاگرد تھے ، باپ اور بیٹے دونوں ابوظفر کی سرکار میں زمرۂ خطاطان میں تھے ۔

شنکر ناتھ کشمیری : خط شکستہ کے استاد ، بہادر شاہ کے میر منشی تھے ۔ ۱۲۶۱ھ میں انتقال ھوا ۔

سید محمد ناصر وزیر : حضرت خواجہ میر درد کے نواسے تھے نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل تھا ۔

سید حیدر حسین خان: سید حیدر علی کے فرزند ، عربی فارسی کے عالم ، نسخ اور خط گلزار کے ماہر تھے ریاست بیکانیر میں مہتمم بندوبست تھے ۔ عہد شاہی میں اُن کے باپ داروغہ توپ خانہ تھے ۔

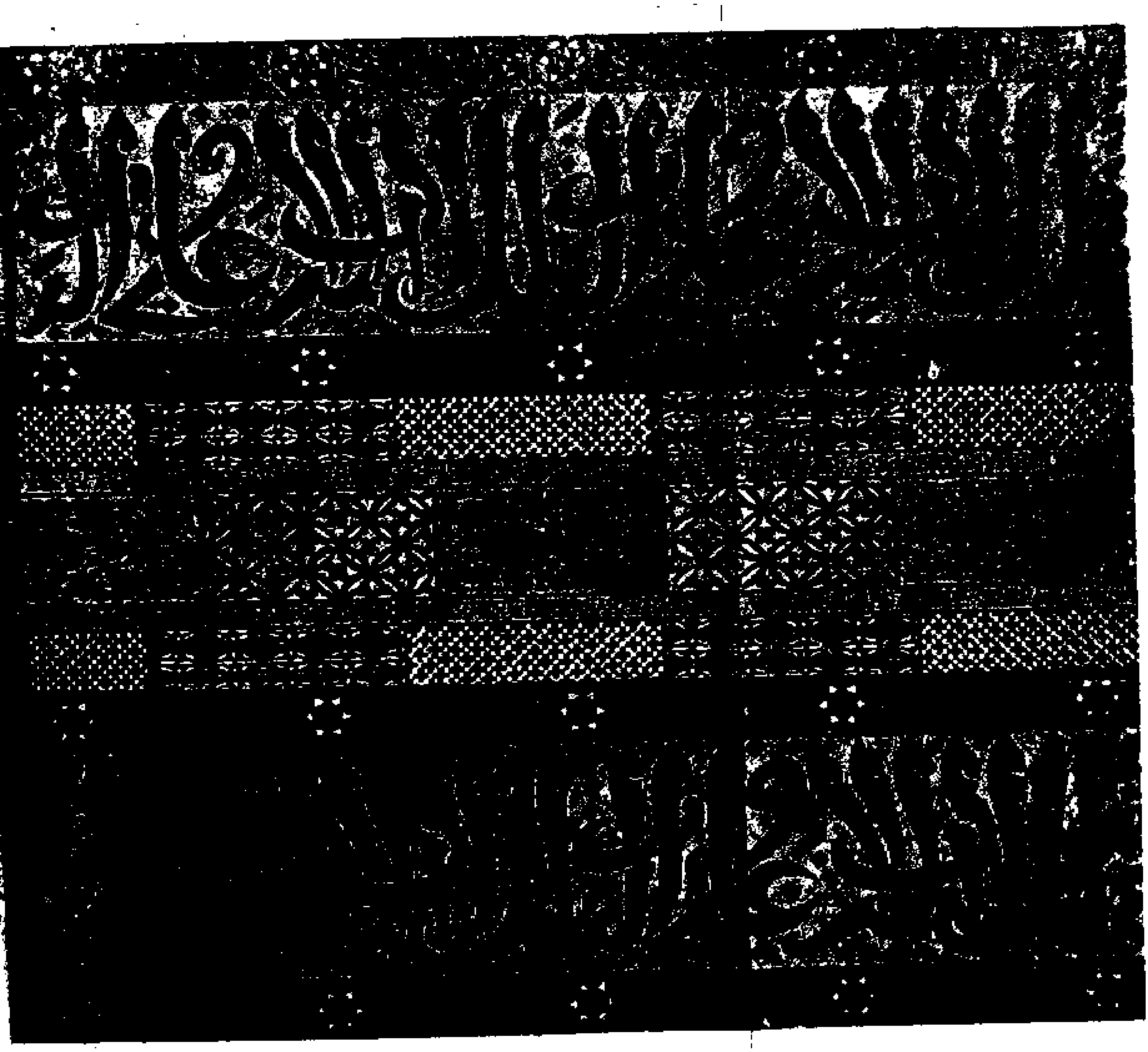
میر امام علی: امام الدین کے لڑکے تھے ، اُن کا شغل لطیف طبابت تھا اور نسخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے ۔

ان کے علاوہ مسلمانوں میں مرزا احمد یار بیگ استاد نسخ ، مرزا عبدالرزاق ماہر نستعلیق اور سید رحمت علی خط نسخ اور نستعلیق میں مشہور ہوئے ۔ اہل ہنود میں راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ ، راجہ ناگرمل کے خاندان سے تھے رائے پریم ناتھ کے شاگرد ہوئے، کافی نام پایا ۔ منشی لچھمن سنگھ ، پنڈت لچھی رام (شاگرد محمد حفیظ خان) کنور پریم کنور ۔ راجہ نند رام ، منشی خوش وقت رائے وانگی ، لالہ درگا پرشاد اور شنکر نوساری بھی مشہور خطاط ہوئے لیکن افسوس ان کے حالات کا ہمیں کوئی علم نہیں ۔

گزشتہ لکھنؤ: جب خاندان تیموریہ کی یادگار سلطنت بہادر شاہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہوگیا ، اسلامی سلطنت ختم ہوگئی ۔ دہلی مٹ گئی ۔ ہزاروں دہلی والے خاک میں جا سوئے اور پس ماندگان سوگوار اور اشکبار ہوکر رہ گئے تو بچے کھچے اُن لوگوں نے جو دہلی کے روح رواں اور اہل کمال تھے اپنی تباہی اور بربادی کے بعد اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ دیکھا کہ دہلی چھوڑ کر فیض آباد اور لکھنؤ وغیرہ میں جا بسیں ۔

يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ
مُّبِينٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُّحْيِ
الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ أَنْشَأَهَآ
أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ
الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَآ أَنْتُمْ مِّنْهُ تُوقِدُونَ
أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى
أَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ إِنَّمَآ أَمْرُهُ
إِذَآ أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ فَسُبْحٰنَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وسلم تسلیما کثیرا



ریشمی بافت میں خطاطی کا کمال

صوبۂ اودھ ان کی دلداری اور دل‌نوازی کا طلبگار اور متمنی تھا ۔ اس لئے کہ دولت مغلیہ کی وزارت کا شرف بہت پہلے سے ناظمان یا صوبہ داران اودھ کو حاصل ھو چکا تھا ۔ پہلے وزرائے اودھ کہلائے، بعد ازاں انگریزوں کی خوشامد کی بدولت نواب غازی‌الدین حیدرخان کے عہد میں ۱۲۲۹ھ سے شاھان اودھ ھو گئے ۔ شاہ کہلانے کے بعد وقار شاھی کا تقاضا تھا کہ دربار لکھنؤ میں بھی وھی آن بان اور شان ھو جو شاھان مغلیہ کے درباروں سے مختص تھی ۔ ویسے بھی دھلی کی تہذیب و تمدن کا نقشہ اُن کے روئیں روئیں میں بسا ھوا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لکھنؤ کو لکھنؤ یا دوسری دلی بنانا چاھتے تھے ۔ چنانچہ جب دھلی کے باکمال بلائے اور بن بلائے لکھنؤ پہنچے اور شاھان اودھ نے انکی شاھانہ انداز پر قدردانی اور سرپرستی کی تو لکھنؤ اپنے معراج کمال پر پہنچ گیا، بلکہ فنون لطیفہ کے بعض شعبوں میں تو دھلی سے بھی بازی لے گیا ۔ یہ تہذیب وتمدن کا آخری نمونہ اور آخری جھلک تھی، جہاں تک لکھنؤ کے علوم و فنون کے ارتقا اور ترقی کا تعلق ھے تاریخ شاھد ھے کہ اسکا آغاز نواب شجاع الدولہ کے عہد ۱۷۷۲-۱۷۵۲ء سے ھوا ۔ اس وقت لکھنؤ میں آغا عبدالرشید ویلمی کے دو شاگرد، ماھر نستعلیق اور شکستہ استاد وقت تھے ۔

منشی چندربھان دھلوی اور منشی سیج بھان: اول الذکر عہد شاھجہانی کے مشہور انشاء پرداز اور شاعر تھے، ۱۸۰۳ء میں انتقال ھوا ۔

میر محمد عطا حسین مرصع رقم: اس دور کے تیسرے استاد تھے ۔ محمد باقر ضغرا نویس (عالم گیر کے درباری) کے فرزند تھے ، مشہور قصہ چہار درویش جو نواب شجاع الدولہ نے لکھوایا تھا آپ ہیءکی تصنیف ہے ۔ نسخ ، نستعلیق اور شفیعہ میں کمال حاصل تھا ۔

شرر لکھنوی مرحوم کی رائے ہے کہ علم خط کی ترقی آصف الدولہ کے عہد کی مرہون منت ہے آن کے عہد ۱۷۷۴ ۔ ۱۷۹۸ء میں عبدالرشید ویلمی کے دو شاگرد جو لاھوری تھے لکھنؤ میں وارد ھوئے ، یعنی ۔

حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ: آصف الدولہ نے ان دونوں استادوں کو ازراہ قدردانی اپنے دربار میں جگہ دی ۔ قاضی نعمت اللہ کو شہزادوں کا اتالیق اور نوراللہ کو دفتر انشاء میں مقرر کیا ۔ ان دونوں حضرات کی بدولت لکھنؤ میں فن خطاطی کو بڑا عروج اور فروغ حاصل ھوا ۔ حافظ نوراللہ کی مقبولیت اور شہرت کا تو یہ عالم تھا کہ لوگ ان کی وصلیوں کو موتیوں کے عوض خریدتے تھے ۔ حافظ صاحب کے نامور شاگردوں میں سے چار بہت مشہور ھوئے ۔

حافظ محمد ابراھیم ابن حافظ نوراللہ: انہوں نے اپنے خط میں ایک مجتہدانہ شان پیدا کی باقی تین شاگرد منشی سرب سنگھ دیوانہ ، میاں وجہ اللہ اور محمد عباس تھے ۔

حافظ محمد ابراھیم کے بھی کئی شاگرد ھوئے ، آن کے فرزند حافظ سعیدالدین ، منشی عبدالحمید (خریطہ نگار) منشی

هادی علی اور پنڈت منسا رام جو نستعلیق اور نسخ کے علاوہ طغرا نگاری میں بھی ماہر تھے، منشی ہادی علی کے شاگرد رشید منشی شمس‌الدین اعجاز رقم ہوئے - انہوں نے خطاطی پر کئی رسالے لکھے - آخری دور لکھنؤ میں اکثر خطاط اعجاز رقم ہی کے تلمیذ یافتہ تھے - اسی طرح قاضی نعمت‌الله کے صاحبزادے مولوی محمد اشرف اور مولوی قل احمد ہوئے ان شاگردوں کے بھی متعدد شاگرد ہوئے -

آغا عبدالرشید ویلمی کے مقلدین میں مرزا محمد علی بن مرزا خیرالله فرماں نویس اور ان کے شاگردوں میں خلیفه بخش‌الله اور میر نثار علی مشہور ہیں - خط شکسته میں مرزا احمد طباطبائی استاد ہوئے - اُن کے علاوہ کتابت خاں، میر سید علی خاں، حاجی قاسم، حافظ محمد خورشید، محمد نصیرالدین اور محمد بہاءالله نے شہرت اور ناموری پائی -

طبقهٔ علماء میں سے علامهٔ تفضل حسین خاں (عہد اصف‌الدوله) نستعلیق اور شکسته کے استاد تھے - انشاالله خان انشا سے ان کے گہرے مراسم دوستانه تھے -

دور حاضر: کے شہرهٔ آفاق خطاط منشی محمد یوسف خلف منشی محمد دین مرحوم ہیں - یوسف کے حسن قلم کے نقوش سے پارلیمنٹ اور سیکریٹریٹ نئی دھلی کے در و دیوار آراسته ہیں اور اب مملکت پاکستان اُن کی پرکاری سے فیض یاب ہو رہی ہے - موجوده پاکستانی نوٹوں میں یوسف ہی کا حسن خط جلوه گر ہے - کسی کو رقابت کا بھی یارا نہیں - کون اپنی انگلیاں کٹوائے - یوں ان کا فیض عام جاری ہے -

آن کے نامور شاگرد عبدالمجید دہلوی خلف غلام محمد مرحوم مشہور خطاط ہیں، جو یوسف کے غمزہ و ناز نہیں اٹھا سکتے انھیں مجید کی عشوہ گری اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

مجید ابھی نوجوان ہیں، چالیس کی عمر میں یہ عالم ہے کہ تقریباً تمام خطوط میں آن کا قلم پرکاریاں دکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے آرٹ سے نت نئے ڈیزائن پیدا کر کے حسن کی بھی تخلیق کرتے ہیں۔ مزار قائد اعظم کا کتبہ انھی کا لکھا ہوا ہے۔ شاہ فاروق اور شاہ ظاہر شاہ جب پاکستان آئے تو انھوں نے دونوں کو ایک رباعی لکھکر پیش کی۔ مجید کے شاگرد رشید امتیاز علی دہلوی عرف پیر جی ہیں، انھوں نے بھی نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل کیا ہے۔

موجودہ دور ترقی میں ہماری خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بالخصوص شعر وادب میں لیکن فن خطاطی میں مخدرات تیموریہ کے سوا آپ نے اب تک کسی خاتون کا نام نہ سنا ہوگا۔ اس فن لطیف میں بھی ہمارے پاکستان میں دو باکمال خوش نویسہ موجود ہیں۔ اول یوسف صاحب کی حقیقی بہن فاطمہ الکبریٰ دہلوی ہیں جو خط نسخ میں قرآن مجید لکھتی ہیں۔ دوسری خاتون انوری صاحبہ دہلوی، مولوی عبدالحمید مدیر رسالہ [illegible] دہلی کی خالہ زاد بہن ہیں، امتیاز علی کی شاگرد ہیں اور [illegible] نستعلیق لکھتی ہیں۔

اسی طرح لاھور میں تاج الدین زریں رقم مرحوم نہایت مشہور و معروف خطاط تھے ۔ الماس لاھوری حیات ھیں جو اپنے الماسی خط سے خط میں چمک دمک پیدا کر رھے ھیں ۔ بنگال ، سرحد اور سندھ میں بھی نامی گرامی خطاط موجود ھیں ۔ افسوس! ھم آن ماھران فن کے نام نامی سے واقف نہیں ۔ یقین کیجئے کہ اس میں ھماری کوتاھی کو مطلق دخل نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار اول تو خود وہ خطاط ھیں جو جواھر رقم کرتے ھیں لیکن اپنا نام نہیں لکھتے ۔ پھر آن ناشرین کی ستم ظریفی ھے کہ مصنف ، مؤلف مترجم اور مطبع کا نام تو قانون کے ما تحت درج کرتے ھیں اور آس خوش رقم کو قطعاً فراموش کردیتے ھیں جو اپنے حسن کتابت سے کتاب کو زینت بخشتا ھے اور چار چاند لگاتا ھے ۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ھے کہ ھر اخبار رسالے اور کتاب میں کاتب یا حرف پرداز (کمپوزیٹر) کا نام اور شہریت لازمی طور پر درج کی جائے ۔ اگر یہ تجویز عمل میں آگئی تو یقین کیجئے کہ یہ ایسی حکمت اور خدمت ھوگی کہ ھر عہد اور ھر دور کا تذکرۂ خطاطان بغیر کسی کاوش و سعی کے خود بخود مرتب ھوتا رھے گا ۔ بھر حال اس عذر و معافی کے ساتھ ھم بشرط زندگی ، فرصت اور معلومات آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کی ضرور تلافی کریں گے ۔

دیگر ممالک میں رسم الخط : ھمارے موضوع اور سلسلۂ خطوط کا تقاضا یہ تھا کہ مصر ، عرب اور عجم کے بعد آن ممالک اور اقوام کا ذکر کرتے جہاں عربی و فارسی خطوط نے ماضی بعید یا قریب میں رواج پایا اور آج بھی وھاں مستعمل

ھیں اس کے بعد بر صغیر ھند و پاک کی تاریخ بیان کی جاتی ۔ یہ تقدیم اور تاخیر مصلحتاً اس لئے عمل میں آئی کہ ابھی ھمیں اپنے ملک پاکستان کے مسئلہٴ رسم الخط کو بھی زیر بحث لانا اور اس پر اظہار خیال کرنا ھے ۔ اس ضمن میں یقیناً دوسرے ممالک کے خطوط کا حوالہ دینا پڑتا اور حوالہ آسی وقت دیا جا سکتا ھے کہ اسکی نظیر پہلے سے موجود ھو، موجودہ مقام ھی اُس کا صحیح مقام ھے لہذا اپنے ملکی مسئلہٴ رسم الخط کو چھیڑنے سے قبل ھم دیگر ممالک کے رسوم الخط کی کیفیت بیان کرتے ھیں :

تاریخ کی روشنی میں کم ازکم اب تک یہ تو ثابت ھوچکا ھے کہ دنیائے اسلام کا صدیوں کا مشترکہ مقدس خط عربی ھے اور اس کا نام نسخ ھے، اُس کے بعد نستعلیق کا مقام ھے ۔

ترکی : خلافت بغداد اور دولت مغلیہ کے زوال کے بعد ایشیا اور یورپ میں اسلام کی علمبرداری سلاطین عثمانیہ کو مقدر ھوئی، چنانچہ موجودہ دور جمہوریت سے قبل تمام سلاطین عثمانیہ کا لقب امیر المومنین تھا ۔ اس وقت بغداد، اصفہان، شیراز اور دلی مرحوم کی طرح قسطنطنیہ بھی علم و ادب کا گہوارہ اور مرکز تھا ۔ تاریخ شاھد ھے کہ ترکی کے اس دور ملوکیت میں لسانیات اور علم خط نے بڑا عروج پایا ۔ چنانچہ تحقیقات ماھر میں کتاب انتشار الخط العربی کے حوالہ سے ھمیں ایک مشہور و معروف خطاط مولانا ضیاٴالحق حسام الدین چلپی مرید خاص حضرت مولانا روم متوفی (۶۸۳ھ) کا ذکر ملتا

ہے ۔ یہ نستعلیق کے استاد تھے ۔ مثنوی شریف کا ایک بڑا حصہ انھی کا نقل کردہ ہے ۔

باب عالی میں ترکی خطوط — دشتی اور دیوانی — کے ساتھ ساتھ نسخ ، محقق ، ریحان ، ثلث ، توقیع اور رقاع جاری تھے ۔ مصطفیٰ کمال پاشا مرحوم کے دور سیادت میں مغربیت کے زیر اثر اب عام مراسلت لاطینی رسم الخط میں ہوتی ہے غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے بہت قریب ہے ۔

مصر : دنیا میں جس قدر نمونے خطوط کے موجود ہیں ان کی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے اور مصری ہی اس کے موجد ہیں ۔ عرب کے دیگر علوم و فنون کا منبع اور سر چشمہ بھی مصر ہی ہے ۔ بالخصوص عہد فاروقی رض سے اب تک اسلامی حکومت قائم ہے اور اس کا ایک سر چشمہ اب بھی ''جامع ازہر،، اسلامی یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے جس سے تشنگان علوم سیراب ہورہے ہیں ۔

مصر کی سرکاری زبان عربی اور رسم الخط نسخ ہے اور اس نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ آج اس کا اپنا ٹائپ اور ٹیلی پرنٹر تک موجود ہے جس کے ذریعہ اسلامی ثقافت اور صحافت زندہ اور مستحکم ہے ۔ علماء مصر کی مختلف علوم و فنون پر مشتمل بیش بہا تصانیف آئے دن مصر سے شائع ہوتی رہتی ہیں ۔

عراق ' حجاز ' نجد ' یمن ' شام جسطرح پنج تن پاک کے نام ہمارے ورد زبان ہیں اسی طرح ان مقامات سے اسلام کی قدیم تہذیب اور تاریخ وابستہ ہے اور یہ وابستگی اور

رشتۂ اخوت ایسا ہے جو ابد تک نہیں ٹوٹ سکتا ۔ آغاز اسلام سے دور حاضر تک اسلامی حکومت چلی آتی ہے ۔ ماضی بعید میں یہ ممالک خط کوفی کے مرکز تھے لیکن فی زمانہ یہاں بھی عربی زبان اور خط نسخ جاری ہے ۔

الجریہ، مراکش، قیروان، ٹونس، طرابلس : یہ بلاد مغربیہ کہلاتے ہیں ۔ ان کی زبان اور رسم الخط بنیادی طور پر عربی ہے لیکن موجودہ خطوط مغربیہ —— خط الفاسی، خط ٹونسی اور خط الجریہ — جو خط کوفی سے ماخوذ ہیں، کی طرز کتابت پیچیدہ اور نسخ کے حسن سے نسبتاً محروم ہے چونکہ یہ ممالک فرانس کی سیادت اور قیادت میں ہیں اس لئے فرانسیسی خط بھی جاری ہے ۔

سوڈان، زنجبار، حبش، حوسیہ، مڈگاسکر، ھلجاشیہ :

ان ممالک میں بھی عہد اسلام سے عربی خط رائج ہے، اصحمہ نجاشی والئی حبش رسول اکرم ص کا وہ رفیق صادق تھا جس کے نام حضور کا سب سے پہلا فرمان رسالت جاری ہوا ۔ حبش کا موجودہ خط، مذکورۂ بالا مغربی خطوط سے ماخوذ ہے مگر بھدا اور ثقیل ہے ۔ حوسیہ، مڈگاسکر اور ھلجاشیہ کا عام اور مراسلتی خط نسخ ہے ۔

اندلس : جب قیروان سے ممالک مغربی کا دارالخلافہ اندلس میں منتقل ہوا تو یہاں ایک نیا خط، خط آندلسی یا قرطبی جاری ہوا جو شمالی امریکہ میں پھیلا اور قدیم رسم الخط فنا ہوگیا ۔ اندلس کی قدیم عمارات کے کتبات قدیم خط کوفی میں ہیں ۔

روس : اس کے ماتحت قازن، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دیگر اُن صوبوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں زبان عربی اور رسم الخط نسخ ہے ۔ تمام دنیا میں اشتراکیت کی نشر و اشاعت کے لئے روس درجۂ اول کی تمام زبانوں اور رسوم خط میں اپنا پروپیگنڈا کر رہا ہے ۔ اسی لئے اس نے پاکستان کی سب سے زیادہ مقبول زبان اور رسم الخط اردو یا نسخ ٹائپ میں اپنا روسی لٹریچر شائع کیا ہے ۔ چنانچہ کتاب حوالہ " یو، ایس، ایس، آر " کی ایک ضخیم جلد میں اسکا دستور اور تمام ملکی ترقیات کی مفصل کیفیت مذکور ہے ۔

چین : چینی زبان اور رسم الخط دونوں نہایت مشکل ہیں ۔ ان کو سیکھنے کے لئے کم از کم چار ہزار الفاظ یاد کرنیکی ضرورت ہے ۔ کیونکہ اس زبان میں ایک لفظ کا تلفظ تقریباً دس یا اس سے بھی کچھ زائد معانی کا حامل ہے ۔ قدیم خط مصور تھا ۔ پرانے کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۸۲۷ ق م سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک رائج رہا ۔ اس کے بعد حرفی دور آیا ۔ گارساں د تاسی اپنے مقالہ ۱۸۷۲ء میں لکھتا ہے :

" چینی مسلمانوں کے زیر اهتمام مطابع جاری ہیں جہاں سے عربی کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں متن کے ساتھ ساتھ چینی ترجمہ بھی درج ہوتا ہے "

دور حاضر میں بھی جن مقامات پر مسلمانوں کی اکثریت ہے عربی زبان اور خط نسخ رائج ہے ۔ مختلف شہروں میں جا بجا عربی کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ چین نے بھی اپنے ملک کے دستور اور ترقیاتی کارناموں کو ایک نہایت ہی خوبصورت

جلد میں مصور شائع کیا ہے جس میں چینی، نسخ اور رومن ٹائپ میں تمام کیفیت درج ہے۔

ایران: جدید ایران مختلف علوم و فنون کا مرکز ہے۔ حکومت اور عوام کی زبان فارسی اور رسم الخط نسخ اور نستعلیق ہے۔ متعدد رسائل و اخبارات کے علاوہ آئے دن نہایت بیش قیمت اور مفید کتب شائع ہوتی ہیں۔

فرانس: مولانا شبلی مرحوم کے بقول:

وہ نیزہ خونفشاں جو چل کر ٹھیرا تھا فرانس کے جگر پر

ابتدائی اور درمیانی فتوحات اور عربی تمدن کے زیر اثر فرانس میں عربی زبان اور عربی خط رائج ہوگیا تھا ورنہ اس سے قبل لاطینی حروف ابجد جاری تھے۔ عربی خط ۱۰۹۱ء تک جنوبی اطالیہ اور سسلی میں جاری رہا جسکا ثبوت فریڈرک ثانی کی قبر واقع روم (سسلی) کے اس کتبے سے ملتا ہے جو عربی میں ہے۔آج بھی پیرس میں عربی کی نایاب کتابوں کے علاوہ اخبار اور رسائل جاری ہیں۔ اردو کی صداقت اور مقبولیت کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گارساں دتاسی مشہور فرانسیسی مستشرق ہندوستان سے نہ صرف عربی فارسی بلکہ ہندی اور اردو کا تمام لٹریچر فرانس منگا کر اپنی علمی پیاس بجھاتا تھا اور اس سے دوسروں کو بھی سیراب کرتا تھا اس بھی خطبات اردو کے خطبات عالیہ سر راس مسعود مرحوم کی عنایت انجمن ترقی اردو کی توجہ سے ہمارے اردو ادب میں ... ہوچکے ہیں۔

لندن: کمبرج اور آکسفورڈ دونوں جامعات میں عربی تو بہت پہلے سے داخل تھی نیز عربی کتابت پر مستشرقین کو جو عبور پہلے حاصل تھا اب اس میں بھی کچھ ترقی ہوگئی ہے ۔ جہاں تک اردو اور خط نستعلیق کا تعلق ہے ہندوستان میں عہد برطانیہ کے آغاز ہی سے سلطنت کا کاروبار چلانے کیلئے لندن کی دونوں جامعات میں شامل ہوگئے تھے اور آج تک شامل ہیں ۔ اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگریزوں نے اپنی زبان انگریزی اور لاطینی یا رومن رسم الخط کو اپنا ذریعہ بنایا ، ہنوز یہی وسیلہ جاری ہے ۔ انگلستان کے بعض مطابع کتب عربی بھی شائع کرتے ہیں لیکن فرانس اور جرمنی سے کم ۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں السنۂ شرقیہ کے قدیم و جدید ادب اور آرٹ کی ایک بڑی دولت محفوظ ہے ، حضرت اقبال مرحوم کے بقول :

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
کہ دیکھو انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

پاکستان میں بھی برطانوی محکمۂ اطلاعات کی جانب سے مختلف قسم کا لٹریچر اردو زبان اور رسم الخط میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر شائع ہو رہا ہے ۔

جرمنی: یہاں عربی زبان کی تعلیم کا رواج اور معیار بلند ہے ۔ حیرت کا مقام ہے کہ عربی کی تعلیم کے لئے ہم جرمن پروفیسروں کو اپنے ملک میں بلاتے ہیں ۔ ہمارا اردو نستعلیق ٹائپ سب سے پہلے جرمن ہی میں ایجاد ہوا تھا ۔ اسکا

خوبصورت نمونہ جیبی سائز کا دیوان غالب اردو اور مسیح الملک حکیم اجمل خان شیدا دہلوی کا دیوان ہے ۔ لپزگ (جرمنی) سے عربی کی اکثر نادر و نایاب کتب شائع ہوتی ہیں ۔ جرمنی میں اردو ٹائپ روز بروز فروغ پا رہا ہے جسکا ثبوت ادارہ اطلاعات جرمنی کا وہ لٹریچر ہے جسکی اشاعت پاکستان میں ہو رہی ہے ۔

ہالینڈ : السنہ شرقیہ (عربی ، فارسی ، چینی) کا مرکز ہے ۔ لیڈن کا نامور مطبع برل عربی کی اکثر قدیم و نایاب تاریخی کتب شائع کرتا ہے ۔ یہاں خط نسخ کے خطاط بھی موجود ہیں ۔

امریکہ : روس اور برطانیہ کی طرح امریکہ سے بھی عربی اخبارات ، رسائل اور کتب شائع ہوتی ہیں ۔ اسی مناسبت سے وہاں عربی کتابت بھی جاری ہے ۔ آج امریکن سیاح اور علم دوست امریکی ہمارے عربی ۔ فارسی اور اردو تبرکات قدیم کے ہم سے زیادہ محافظ قدردان اور خریدار ہیں ۔ روس کی طرح امریکہ کے شعبہ اطلاعات نے بھی اپنے دستور اور ملکی ترقیات سے پاکستان کے عوام کو مطلع کرنے کیلئے اردو زبان اور نسخ ٹائپ میں نہایت شاندار مصور مجلدات شائع کئے ہیں ۔

انڈونیشیا : ماضی قریب میں ہمارے ساتھ ساتھ آزاد ہوا ہے ، وہاں مسلمانوں کی تعداد ۶ کروڑ پچاس لاکھ ہے ۔ اردو بولنے اور لکھنے والے یہاں بھی موجود ہیں ۔ عربی زبان اور خط نسخ کا بھی رواج ہے ، انڈونیشیا کے محکمہ اطلاعات نے

بھی اپنے ملک کی ترقیات اور ترقیاتی منصوبوں کو نسخ ٹائپ میں شائع کر کے پاکستانی عوام سے اپنا رشتۂ محبت و اخوت زندہ اور تازہ کیا ھے ۔ سرکاری زبان ملائی ھے اسکا خط نسخ ھے ۔

جاوا اور ملایا: ان دونوں جزیروں کے باشندوں نے رسم الخط کی تعلیم عربوں سے حاصل کی لیکن بعد میں اپنے رسم الخط میں چند نقاط اور چند کششوں کے ذریعہ ایزاد اور ترمیم کر لی ھے ۔ لیکن مراسلت عربی رسم للخط میں کرتے ھیں ۔

کردستان: گو زبان بالکل جدا ھے لیکن خط زمانۂ دراز سے عربی ھے جس میں حسب ضرورت انھوں نے ذاتی تصرفات سے کام لیا ھے ۔

افغانستان: یہ بھی ھمارا قدیم گہوارۂ اسلام ھے اور ایک مدت دراز کے بعد ھوشیار اور راہ ترقی پر گامزن ھوا ھے ۔ دفاتر کی زبان فارسی اور بولی پشتو ھے ۔ افغانی ابجد میں (۴۰) حرف ھیں جو نسخی کہلاتے ھیں ۔ سلاطین غوریہ میں ملک معز الدین محمد بن سام نہایت زود نویس اور خوش رقم تھے ۔ سلطان محمد خندان، سلطان علی مشہدی کے شاگرد اور ماھر نستعلیق تھے ۔ میر عبدالرحمن ھروی استاد نستعلیق کا شمار آقا عبدالرشید ویلمی کے شاگردان میں ھوتا ھے ۔ سید محمد داؤد الحسنی ماضی قریب میں نامور خطاط گذرے ھیں، اس باکمال خوش نویس نے گلستان سعدی کا دیباچہ جو (۵۰۰) کلمات یا (۲۲۷۰) حروف پر مشتمل ھے صرف ایک مربع انچ پرزہ کاغذ پر تحریر کیا تھا ۔

پامیر: قبل اسلام پامیریوں کا قومی خط پہلوی تھا اب بھی افغانی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھتے ھیں۔

بلوچستان، مکران: بلوچی ابجد عربی ھے، لیکن اس میں چار حروف (پ، چ، ژ، گ) اور تین حروف ھندی (ٹ، ڈ، ڑ) اپنے ھاں شامل کر لئے ھیں۔

بھارت: دور حاضر میں عربی زبان اور رسم الخط نسخ اپنی مذھبی حیثیت میں صرف مسلمانوں کیلئے باقی رہ گیا ھے۔ فارسی زبان صرف اھل ذوق کا سرمایۂ نشاط ھے۔ اردو زبان اور خط نستعلیق جو قیام پاکستان سے قبل سنسکرت، ھندی، پنجابی، بنگالی، گجراتی، مرھٹی، کشمیری، گورمکھی، تامل اور ملایالم وغیرہ تمام ھندوستانی زبانوں اور رسوم خط پر چھایا ھوا تھا اب آسے ھر جگہ ھر طرح سے ختم کیا جا رھا ھے، ختم ھوگا یا نہیں، لیکن صورت حال یہ ھے کہ سیاسی تقاضوں کے پیش نظر دیگر صوبجاتی زبانوں اور رسوم خط سے تو چشم پوشی برتی جارھی ھے اور ھندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کے روپ میں صدھا برس کی قدیم اور نیم مردہ، دیوتاؤں کی زبان سنسکرت میں از سر نو روح پھونکی جا رھی ھے۔ قیام پاکستان سے قبل ریاست حیدر آباد دکن نے اردو نستعلیق اور نسخ عربی میں نہایت کامیاب ٹائپ ایجاد کیا تھا۔

ہمارا رسم الخط

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
(اقبال)

رسم الخط

تاریخ کی روشنی میں اقوام عالم کے قدیم و جدید رسوم الخط کا یہ سرسری سا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ تاریخ ایجاد خط سے عہد حاضر تک جس طرح سینکڑوں زبانوں نے جنم لیا اسی طرح رسم الخط نے بھی ہزاروں روپ بدلے، نت نئی صورتوں میں ابھرا اور بے شمار شکلوں میں ہمارے سامنے آیا۔ ہزاروں برس کی اس مسلسل تبدیلی کو دیکھ کر باآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ دنیا اپنی ارتقائی رفتار میں زمانۂ قدیم کی بہ نسبت ترقی کرتے کرتے بہت آگے نکل آئی ہے لیکن با ایں ہمہ اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ کمالات انسانی کی معراج اور منتہا کس مقام پر ہوگی، نظر بر ایں یہی صورت زبان اور رسم الخط کی ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ جو اس وقت پاکستان میں زیر غور اور بحث ہے تاریخ و تہذیب کا کوئی نیا واقعہ یا حادثہ نہیں، اس سے پہلے بھی بر صغیر ہند و پاک میں رسم الخط کی تاریخ اس نوع کے متعدد تغیرات اور تجربات سے گزر چکی ہے۔ راقم میں ہم اس حقیقت کا اظہار کرچکے ہیں کہ پہلے ... تاریخ خطاطی اور مختصر تذکرۂ خطاطان پر

مشتمل تھا ۔ اُس وقت ھمیں رسم الخط کی تبدیلی کا وھم و گمان بھی نہ تھا ۔ اسی لئے ھم سنسکرت اور ھندی نژاد زبانوں کی تاریخ اور رسوم خط کو غیر ضروری سمجھکر نظر انداز کر گئے تھے ، اب چونکہ یہ مسئلہ در پیش ھے لہذا لازم ھے کہ اس پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے ۔

ابتدا میں آپ پر یہ واضح ھوچکا ھے کہ طوفان نوح کے بعد جب سام بن نوح کی اولاد دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی اور بابل میں مہذب حکومتوں کا قیام ھوا تو متعدد زبانیں (السنہ سامیہ) وجود میں آئیں جن کی مختلف شاخوں نے متمدن دنیا میں رواج پایا ۔ ان زبانوں میں تاریخ السنہ کی رو سے آرین ، سامی اور منگولین (مغائی) اُم الاسنہ کہلاتی ھیں ۔ اقوام عالم میں آرین کو نمایاں مقام حاصل ھے ۔ جب یہ قوم مشرق سے مغرب (یورپ اور ایشیا) میں داخل ھوئی تو اُن کی زبان نے متعدد زبانوں کو جنم دیا ۔ ایشیا میں سنسکرت اور فارسی نے شہرت پائی اور یورپ میں یونانی اور لاطینی مقبول ھوئیں اسی طرح جب تبت اور خط سے مغلوں نے نقل و حرکت کی تو چینی ، سیامی اور برمی زبانیں پیدا ھوئیں جن کی ایک مشہور شاخ ترکی ھے ، گویا اصل ماخذ سامی کی شمالی شاخ سے آرامی اور عربی زبانیں نکلیں۔ اس عربی سے خط کوفی نکلا جس کا ترق یافتہ خط عربی نسخ اور آردو نستعلیق ھے ۔ دوسری جانب سامی الاصل کی جنوبی شاخ سے سبائی اور سبائی سے ھندوستانی زبانیں وجود میں آئیں ۔ آخر الذکر ھندوستانی زبانوں کی شاخیں ، پالی ، دیو ناگری اور ڈریوڈین کہلائیں ۔

پالی سے برمی، سیامی، جاوائی اور سنگالی،
دیوناگری سے کورین، کشمیری، گجراتی، مرھٹی اور بنگالی،
اور ڈریوڈین سے ملائی، تامل، تلنگو اور کناری زبانیں نکلیں۔

اس جائزہ سے جو نتیجہ برآمد ھوتا ھے وہ یہ ھے کہ موجودہ ایشیائی اور یورپی تمام رسوم الخط سامی الاصل رسم الخط سے ماخوذ ھیں۔ تمام دنیا کے رسوم الخط (بجز چینی رسم الخط کے کہ وہ اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا ھے) دو صورتوں میں منقسم ھیں، ایک صورت دائیں سے بائیں اور دوسری بائیں سے دائیں طرف تحریر کرنیکی ھے۔ لیکن سامی الاصل رسم الخط کی اساس پر یہ کہنا غلطی نہ ھوگا کہ عہد حاضر کی یوربی، دیوناگری، اور ھندوستان کی دوسری زبانوں کی تحریریں بھی ابتدا میں دائیں سے بائیں سمت ھی لکھی جاتی تھیں مگر مرور ایام اور حالات کے تقاضوں نے اُن کے قدیم رخ کو تبدیل کردیا۔

لاطینی رسم الخط جو اس وقت رومن رسم الخط کے نام سے مشہور ھے کوئی تین ھزار سال پرانا ھے اور بلاشبہ اس نے اس طویل مدت میں اپنے ارتقائی اور تدریجی منازل سے گزر کر اپنے آپ کو اس قدر مہذب اور مقبول بنا لیا ھے کہ آج اُسکا اپنا ٹائپ اور ٹیلی پرنٹر دونوں موجود ھیں۔

عربی رسم الخط (نسخ) جو سامی رسم الخط سے ماخوذ ھے، اسکی عمر کم و بیش چھ ھزار سال ھے یہ بھی ازمنہ قدیم سے نشو و نما اور ترقی پاتے پاتے اب اس درجہ مرصع اور مکلف ھوچکا ھے کہ آج جا بجا صفحۂ روزگار پر اس کے ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کے نقوش مرتسم ھیں۔

عربی کے بعد سنسکرت کا مقام ہے، جس طرح عربی اپنی وسعت، فصاحت و بلاغت اور صرف و نحو کے اعتبار سے ایک جامع اور بسیط السنہ ہے، اسیٔ طرح سنسکرت بھی اپنی جگہ ایک مکمل اور فصیح و بلیغ زبان ہے اور کسی دوسری زبان کی محتاج نہیں بلکہ بعض مادوں اور اشتقاق کی بناء پر قدیم فارسی بھی دراصل سنسکرت ھی کی ایک شاخ ہے۔ اسی لئے آریا قوم اپنی زبان پر فخر کرتی ہے اور یقیناً اُس کا یہ فخر اُسکو زیب دیتا ہے۔

جب آریا قوم ھندوستان میں داخل اور حکمران ہوئی تو اُس وقت یہاں کے لوگ مختلف ھندی زبانیں (عوام کی بولیاں) جو ''پراکرت'' کہلاتی تھیں، بولتے تھے۔ اُنکی یہ بولیاں آریا قوم کے غلبہ اور اقتدار کے باوجود اس حد تک سنسکرت پر اثر انداز ہوئیں کہ ایک مدت دراز تک سنسکرت کے دوش بدوش بولی جاتی رھیں، بالآخر اُن کو سنسکرت کے سامنے بالکل اسی طرح مغلوب ہونا پڑا جس طرح عہد حاضر میں یورپ کی زبانیں لاطینی کے زیر اثر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ھندی اپنے اوصاف دلربائی اور دل نشینی کے علاوہ اپنی قدامت اور اھمیت کی وجہ سے سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے سنسکرت کے نام سے کبھی موسوم نہیں ہوئی ھمیشہ اپنے ھی نام سے پکاری اور گونجتی رھی۔ ''ھندوستانی'' کا جدید نام اہل یورپ کا ساختہ اور پرداختہ ہے۔

اب اردو کو لیجئے۔ یہ دنیا کی جدید زبان ہے اور اُس زمانہ کی یادگار ہے جب سرزمین ھند میں مسلمان فاتحین کے قدم جمے۔ (۶۹۸ء)

درمیان سلطان محمود کے عہد میں اس کی ایک ہلکی سی داغ بیل پڑی ۔ چونکہ یہ زبان لشکر شاہی میں بولی گئی اور "لشکر" کو ترکی زبان میں "آردو" کہتے ہیں اس لئے اردو کہلائی ۔ محمود کے بعد غوری، خلجی، تغلق، لودھی اور آخر میں مغل سلاطین آئے جو (۱۸۵۷ء) تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے ۔ اس طویل قیام کے باعث ملکی باشندوں سے میل جول اور ربط و ضبط میں ترقی ہوئی ۔ سیاسی اور تجارتی امور کے تقاضوں سے شاہ و رعایا ایک دوسرے کی زبان سمجھنے اور سیکھنے پر مجبور ہوئے، اس طرح ملک کی زبان میں ایک نا معلوم سا تغیر پیدا ہونے لگا ۔

ان فاتحین کی زبان ترکی اور فارسی تھی، فارسی کے علاوہ وہ عربی سے بھی روحانی شغف رکھتے تھے کیونکہ یہ انکی مذہبی اور علمی زبان تھی ۔ آن کے قدیم علوم و فنون کا بیشتر سرمایہ بھی اسی زبان میں تھا ۔ ابتدا میں اس تبدیلی کی یہ کیفیت رہی کہ محلات اور دفاتر شاہی میں تو فارسی کا اوڑھنا اور بچھونا رہا لیکن ہندوستانی عوام نہایت آزادی کے ساتھ قدیم ہندی پراکرت بولتے رہے سنسکرت قریب قریب مردہ ہوگئی ۔ بعد ازاں ہندی آہستہ آہستہ فارسی اور عربی سے مخلوط ہونے لگی پھر وہ زمانہ آیا کہ ہندو، فارسی اور مسلمان، ہندی شوق کے ساتھ سیکھنے لگے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عربی، فارسی اور بھاشا میں بڑے پیمانے پر لین دین ہونے لگا ۔ عربی نے اردو کو فصاحت و بلاغت بخشی ۔ فارسی نے لطافت و شیرینی عطا کی، ہندی نے رس اور لوچ پیدا

کیا، سنسکرت اور ترکی کا بھی اس میں رنگ آیا اور یوں یہ انگھڑ بولی اس طرح بنی اور سنوری کہ اس کا رنگ، روپ اور جوبن نکھر آیا ۔ قدیم بھاشا حسرت و یاس کے عالم میں اُردو کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگی ۔ بالآخر اُس کو اپنا رین بسیرا برج کی گلیوں میں کرنا پڑا ۔ برج کی جوگن بنکر برج بھاشا کہلانے لگی ۔ یہ کہنا کہ مغل اُردو کے باغباں تھے بڑی حد تک غلط ہے ۔

حق یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ اصول جہاں داری اور جہاں بانی سے واقف تھے اور رعایا کے دلوں پر حکومت کرنا جانتے تھے، علم و فن کے جویا اور قدر دان تھے، انھوں نے ہمیشہ جغرافیائی حد بندیوں اور ذاتی رجحانات اور جذبات سے بلند تر ہوکر اپنے علوم و فنون دوسروں کو بخشے اور اُن کے سرمایہ کو اپنا ورثہ سمجھا ۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اُردو خود بخود برصغیر ہند و پاک کی راشٹر بھاشا، قومی زبان، بنتی جارہی ہے انھوں نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا ۔ یہ اُردو کی خود اپنی ہمہ گیر صلاحیت تھی کہ اُس نے عربی، فارسی، ترکی اور متعدد دوسری زبانوں کو اپنے میں جذب کر لیا ۔ بلا شبہ اردو، سنسکرت کی طرح نہ تو آریوں کے ساتھ باہر سے آئی اور نہ ترک اور افغان، عربی و ترکی کی طرح اسے اپنے ہمراہ ہندوستان لائے اور نہ انھوں نے اہلِ ہند پر اسے زبردستی ٹھونسا ۔ یہ تو ہندوستان میں از خود پیدا ہوئی اور ملک کی مشترکہ قومی ضروریات نے اسے خود ہی پروان چڑھایا ۔

بہر نوع آردو کے حق میں ان مسلمان بادشاہوں کا تو یہ طرز عمل اور روا داری تھی لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری ایام حکومت سے اور بالخصوص زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی (انگریزوں) نے عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی کے ساتھ کیا سلوک کیا وہ ایک داستان دل خراش ہے۔ ان سفید فام حاکموں نے انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے کی مثل کو صادق کر دکھایا۔ عالمگیر انسانیت، خلوص اور روا داری کے نام پر پہلے چرسا بھر زمین مانگی لیکن اپنی عیاری سے پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے آگ لینے آئے تھے لیکن اپنے کرتوتوں سے ہمیشہ ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں آگ لگاتے رہے خود بچے رہے اور جب صحیح سلامت واپس گئے تو اپنی لگائی ہوئی آگ کو بھڑکتا ہوا چھوڑ گئے۔

(۱۷٦۴ء) میں جنگ بکسر کے بعد شاہ عالم نے جو اپنے باپ دادا کی طرح علم نواز اور ادب پرور تھا لارڈ کلائیو سے معاہدہ کرتے وقت عہد نامہ میں یہ شرط رکھی کہ کمپنی ہندوستانی علم و ادب کی حفاظت اور نگہداشت کریگی اور اخراجات شاہی کے لئے ۲٦ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ بھی شاہ کو پیش کرے گی۔ اس معاہدہ کا کس طرح احترام کیا گیا وہ وارن ہسٹنگز کے عمل سے ظاہر ہے۔ ایک ادنیٰ سا بہانہ تراش کر یہ وظیفہ بند کیا گیا۔ اس زخم کا جو مرہم تجویز ہوا وہ بھی سن لیجئے۔ السنۂ شرقیہ کی اصلاح اور ترقی کے نام پر ڈاکٹر جان گل گرسٹ نے پہلے ایک سوسائٹی قائم کی، پھر (۱۸۰۰ء) میں لارڈ ہسٹنگز نے

فورٹ ولیم کالکتہ میں ایک کالج قائم کیا جسکی دو شاخیں تھیں ، ایک سنسکرت کی ھندوؤں کے لئے اور دوسری عربی و فارسی کی مسلمانوں کیلئے ۔ حالانکہ اس سے قبل ھندو، عربی اور فارسی پڑھتے تھے اور مسلمان ، سنسکرت اور بھاشا ، اور یوں دو بھائیوں کی طرح آپس میں شیر و شکر رھتے تھے ۔ اب جو دو مدرسے ، دو استاد ، دو زبانیں اور دو خیالات ھوئے تو دونوں کا حال و قال بدل گیا ۔ ایک دوسرے کے درمیان غیریت اور مخالفت پیدا ھونے لگی ، یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بنکر الگ الگ ھوگئے دراصل ھندی اور اردو کے درمیان خلیج اور ھندوستان کے بٹوارے کی بنیاد بھی یہیں سے قائم ھوئی ھندوستانی ذھنیت تبدیل کرنے اور نفاق پھیلانے کی یہ بڑی باریک اور گہری سیاسی چال تھی ۔

انگریزوں نے اپنے دفاتر سے سنسکرت اور فارسی کو یکدم اور یک قلم دیس نکالا نہیں دیا اگر وہ ایسا کرتے تو بڑی فاش غلطی ھوتی ۔ اسی لئے ان دانایان فرنگ نے پہلے اردو کا بازار گرم کیا ، اسے بنگال سے پنجاب تک پہنچایا ۔ مسٹر ام کریو کے بقول اس وقت اردو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس طرح فرانسیسی زبان تمام یورپ میں بولی جاتی ھے ، اسی طرح اردو ، ھندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک عوام کی زبانوں پر کھیل رھی تھی اندر ھی اندر فارسی کی جڑیں کھوکھلی ھوکر گرگئیں یہاں تک کہ (۱۸۳۳ء) میں فارسی خارج ھوکر اردو کے نقارے پر کمپنی کا ڈنکا بجنے لگا ۔

ماحول جس میں اردو ادب نے صحیح معنوں میں پہلی بار آنکھ کھولی اور پرورش پائی ۔

مسلمان احسان فراموش اور نا شکرگزار نہیں ۔ ڈاکٹر گل گرسٹ نے ایک معقول عرصے تک اردو کی خدمت کی لیکن ڈاکٹر صاحب کا مقصد تنہا یہ نہ تھا ۔ اس خدمت کے پردے میں دراصل اُن کو اپنے ملک و قوم کی خدمت منظور تھی اور وہ یہ تھی کہ جو انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوکر ہندوستان آئیں وہ اردو داں بنکر اعلیٰ مناصب اور معقول مشاھرے حاصل کریں اور اس طرح ھم پر حکومت کرتے رھیں ۔ یہی نہیں بلکہ تجارت کے ٹھیکہ دار بن کر ہندوستان کی دولت دھڑی دھڑی کرکے لوٹیں اور لندن لیجا کر اپنے ولایتی گونوں کو بھریں ۔ الغرض ان سیاسی اغراض کے ما تحت اردو کی خوب نشو و نما کی گئی لیکن ایسی نشو و نما کہ ھم اپنی قدیم ایشیائی زبانوں سے محروم ھوکر " قصہ طوطا مینا " پڑھنے لگے ، " آرائش محفل " میں محو اور " باغ و بہار " میں گم ھوگئے ۔ ادب کی افادیت اور مقصدیت فنا ھوگئی ۔ "ادب برائے زندگی" کی بجائے " ادب برائے ادب " ھوکر جمالیات اور رومانوں کی نذر ھوگیا لوگ حیات مستعار سے بد دل ھوکر ڈوبنے اور مرنے کی راہ دیکھنے لگے بلکہ بعض تو یہاں تک دل برداشتہ ھوئے کہ فلاح بعد مرگ سے بھی مایوس ھوگئے اور یہ کہنے لگے کہ :

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ھارون اور مامون نے علوم و فنون کے جو خزانے دنیا میں

اپنی یاد گار چھوڑے تھے اور جن سے پورا یورپ متمتع ہوا تھا وہ ہم سے ہزاروں کوس دور سمندر پار ہی رہے ۔ وہ بھی تو اُردو میں منتقل ہوسکتے تھے اور جو ہوئے وہ اس طرح کہ اُن کا قالب انگریزی تھا اور لباس رومن ۔

غضب خدا کا ہمارا ملک، ہماری زبان اور ہماری ہی تحریر اور اُس کی صرف و نحو کے موجد اور راقم انگریز ۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ ہم ہندوستان میں پیدا ہوئے، دم پیدائش سے نوبت مرگ تک اپنی آواز اور اپنی زبان میں بولے، اُسی میں لکھا اور پڑھا اور ہم ہی اُن سے صرف و نحو کی تعلیم لیں ۔ نکتہ چینوں کو ہماری آنکھ کا تنکا تو نظر آیا آنکی آنکھ میں جو شہتیر پڑا تھا وہ اُن کو نہ سوجھا ، شہرۂ آفاق شیکسپیئر انگلستان کا ٹھیٹ باشندہ ، مادری زبان انگریزی ، کلام بے مثل و لاجواب اور صرف و نحو کی اغلاط سے معمور ۔ ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو، برنارڈ شاہ کے بعد جب گالروزی کو ،، نوبل پرائز ،، ملا تو لوگوں نے برنارڈ شاہ سے گالروزی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا ،، یہ بڑی خوشی کی بات ہے، وہ بہت ہی اچھا لکھتا ہے مگر اُس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ نہایت صحیح انگریزی لکھتا ہے ،، ۔

انہی ڈاکٹر گل گرسٹ نے انگریزی اردو لغت کی تالیف اپنے ذمہ لی لیکن کمپنی چونکہ اردو کی مخالف تھی اس وہ بھی ادھوری رہ گئی ۔ اس انگریزی سوسائٹی اور ولیم سے تو وہ اردو سوسائٹی بسا غنیمت تھی جو (۱۸۲۶ء) بعہد حضرت بہادر شاہ جرمن ڈاکٹر اسپرنگر

قائم ہوئی تھی جس کے کرتا دھرتا منشی کریم الدین پانی پتی، پنڈت رام کشن، پنڈت اجودھیا پرشاد، ہردیو سنگھ اور لالہ رامچندر ہوئے۔ ان لوگوں کی بد ولت تذکرہ شعرائے عرب، تذکرہ شعرائے ہند اور نا معلوم کیا کیا کچھ وجود میں آیا۔

قصہ کوتاہ جب فارسی کی رسم فاتحہ ہوگئی تو لارڈ میکالیے نے اردو کا بھی تیجہ کر ڈالا جسکی بابت انھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں یہ کہا تھا۔

"انگریزی تعلیم دینے سے آہستہ ہندوستانی ایک قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن خیالات، رجحانات، تہذیب اور معاشرت کے لحاظ سے یکسر مغربی ہوگی"۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۸۳۵ء میں فورٹ ولیم کالج کا دروازہ بند کیا گیا اور آکسفورڈ، لندن کے پیمانے پر کلکتہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تکمیل شوق کی خاطر یا آنسو پونچھنے کیلئے السنۂ شرقیہ برائے نام داخل نصاب رہیں، اس طرح بڑے ٹھاٹ کے ساتھ انگریزی کے درس شروع ہوگئے۔ محکوم ہندوستانی الف سے اللہ اور رے سے رام جپنے کی بجائے، سی اے ٹی 'کیٹ' آر اے ٹی 'ریٹ' اور جی او ڈی 'گوڈ'، میں گٹ پٹ کرنے لگے۔

انگریزی زبان کی تعلیم کے خلاف ہندوستانی رعایا ہی نے نہیں، ہنری کارٹر، ونسنٹ اسمتھ اور دیگر انگریز مدبروں اور پادریوں تک نے آواز بلند کی، انھوں نے بار بار

بتایا کہ محض فوجی قوت کے بل بوتے پر ہندوستانی اقوام پر حکومت کرنا محال ہے جنکی زبان اور رسم و رواج میں اختلاف ہے محکوم قوم کی ہمدردی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب حکومت اپنی رعایا سے براہ راست تعلق پیدا کرے مشہور پادری مستشرق گارساں دتاسی سالہا سال تک تعلیم بذریعہ انگریزی کے خلاف اور اردو زبان اور رسم الخط کی حمایت میں اپنے خطبات میں جہاد کرتا رہا لیکن انگریزوں کے کان پر ایک جوں تک نہ رینگی۔

یہی شکایت اور مطالبہ ہمیں اپنے پاکستان کے سابقہ حاکموں سے رہا اور موجودہ حکومت سے بھی یہی گذارش ہے کہ وہ تمام علوم و فنون کی تعلیم ہمیں اپنی زبان میں دے جو اسکی بجا طور پر صلاحیت رکھتی ہے سر سید اعظم رح نے صدہا مخالفتوں کے طوفان اور کفر کے فتووں کی آندھیوں میں "سائینٹفک سوسائٹی اور مدرسۃ العلوم، علیگڑھ" قائم کیا۔ بہزار حیلہ و خوشامد انگریزی کی تعلیم دی، غیر ملکی علوم و فنون پڑھائے لیکن ذریعہ تعلیم اردو رکھا۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے بھی سر سید اعظم رح ہی کی تقلید کی اور برسوں کی منزلیں مہینوں میں طے کرائیں۔ اردو کا خزانہ علوم و فنون سے معمور کر دیا۔ ہمارا "اردو کالج، کراچی" بھی اسی کی یادگار ہے، بابائے اردو اسی موئی مٹی کے موتام ہیں۔ ہم انگریزی کے نہ پہلے دشمن تھے اور نہ آج ہیں، کسی زبان کے بھی دشمن نہیں، ہمارا اختلاف تو صرف

ذریعہ تعلیم کا ہے - ۱۵۰ طویل برس گذر جانے کے باوجود نہ ہم کو صحیح معنوں میں انگریزی آئی اور نہ علوم و فنون حاصل ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ہم یورپ کے فونوگراف بن گئے، ہمارے دیسی ریکارڈ پر انگریزی نغمہ بجنے لگا -

دراصل زبان و معاشرت کا اختلاف بہت ہی سخت ہوتا ہے، انگریزوں نے اپنی حکومت کی خاطر ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط سیکھا، جب وہ اس کے ماہر ہوگئے تو ہمیں دھتا بتائی، ہماری بلی ہمیں سے میاؤں کرنے لگی - مذہب کی بنیاد پر ہندی اور اردو کی جو خلیج انھوں نے بنگال میں قائم کی تھی وہ اب پایاب ہوگئی - صدیوں کا میل ملاپ اور بھائی چارا ٹوٹ گیا - ہندو اپنا مندر اور مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ الگ چننے لگے - آہستہ آہستہ یہ نا اتفاقی یہاں تک بڑھی کہ دشمنی بن گئی - ہندوؤں نے کہا کہ اردو زبان اور اسکا رسم الخط قرآنی ہے - ہم دیوتاؤں کے پجاری ہیں، سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط، دیوتاؤں کی زبان اور دیوتاؤں کی تحریر ہے ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اپنی زبان اپنے خط اور اپنے مذہب کو بھرشٹ کریں - مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم توحید کے پرستار ہیں، ہمارا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، کتاب ایک ہے اور مذہب، زبان اور تمدن بھی ایک ہے - بلاشبہ عربی ہماری مذہبی زبان ہے - یہ اردو جس سے اب تمھیں پرخاش ہے، ہماری زبان نہیں، تمھاری ہے،

ہم تو ترکی اور فارسی بولتے آئے تھے ، اسے ہم نے یہاں آکر تم سے سیکھا ، تمہاری ھی خاطر اسے عزیز کیا ، اب اس سے یہ انحراف ، سنسکرت سے عقیدت اور عربی سے دشمنی کیوں ؟ بقول ڈاکٹر سپرو ، اردو اب ایک مشترکہ قومی سرمایہ بن چکی ہے جسکی تقسیم ناممکن ہے ۔ اگر تم اسے چھوڑ سکتے ہو تو چھوڑ دو نیم مردہ اور فراموش شدہ سنسکرت کو اختیار کر سکتے ہو تو کرلو لیکن اردو سے کنارہ کش ہونا اب ہمارے لئے محال ہے ۔

اس قضیہ نے ایسا طول پکڑا کہ برسوں خون خرابے رہے اور کوئی فیصلہ نہ ہوا ، آخر انگریزی سرکار میں دونوں طرف سے آزادی کا مقدمہ پیش ہوا ۔ یہ مقدمہ بھی شیطان کی آنت ثابت ہوا ۔ ہزاروں متعلقہ اور غیر متعلقہ تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اس دوران میں بھی ہم برابر لڑتے کٹتے اور مرتے رہے آخر وطن تقسیم ہوا ۔ ایک دل تھا اس کے دو ٹکڑے ہوگئے ۔ دونوں طرف از سر نو انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ۔ ہزاروں عصمتیں برباد ہوئیں ، لوگ در بدر ہوئے ، تباہی و بربادی آئی اور انگریز ہم پر اور ہماری حالت زار پر ہنستے اور مسکراتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے ۔ اب اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ ۔

اب آزاد بھارت کا یہ فیصلہ ہے کہ اردو دیوناگری رسم الخط اختیار کرلینا چاہیے اور اپنا رسم الخط جو عربی سے ماخوذ ہے چھوڑ دینا چاہیے

کی اس تبدیلی کی موافقت اور مخالفت میں اہل ھند کے پاس اپنے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر کافی وزنی دلائل اور ثبوت موجود ھیں اور اس کے لئے وہ آپس میں سر بہ گریبان بھی ھیں ۔ ھمیں اُن کے اس گھریلو اور داخلی مسئلہ سے بظاھر کوئی سروکار نہیں لیکن یہ کیا قیامت ھے؟ کہ جس مذھب زبان اور تہذیب کی خاطر ھم نے فلک شگاف نعرے لگائے ، اپنی جان و مال ، عزت و آبرو اور آثار ثقافت کو ٹھیس پہنچائی ، بہت کچھ کھو کر یہ محدود اور مختصر ساخطۂ پاک قبول کیا ۔ کیا یہ اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ یہاں ھم آزاد ھوں گے ، ھمارا مذھب ، ھمارا دستور ، ھمارا نظام تعلیم ، ھماری زبان اور ھمارا رسم الخط آزاد ھوگا ۔ کسی کو ھماری طرف ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے کی مجال نہ ھوگی ۔ اگر مذھب کا تہذیب سے ، تہذیب کا ثقافت سے ، ثقافت کا زبان سے اور زبان کا رسم الخط سے کوئی رشتہ نہیں تو تقسیم ھندوستان کے جواز میں یہ سوال بار بار اور پے درپے کیوں اٹھایا گیا تھا؟ اگر صرف رسم الخط ھی کی تبدیلی منظور خاطر ھو سکتی تو آج بھارت کی قومی زبان ھندی کے بجائے بڑی حد تک اردو ھی ھوتی ۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ دیوتاؤں کی زبان اور دیوتاؤں کی تحریر تھی تو کیا انگریزی زبان اور لاطینی رسم الخط اسلامی ھے؟ کیا یہ غیر جنس نہیں؟ کیا اسے غیر جنسوں نے محض اپنی خاطر ایجاد نہیں کیا تھا ۔ رومن رسم الخط کی تجویز ھی اُس وقت پیش کی گئی تھی جب اردو ٹائپ کا کوئی وجود نہ تھا ۔ اردو ٹائپ کی ایجاد اور پریس کا انعقاد بھی

اسی ضرورت کے ماتحت (۱۸۴۰ء) کے لگ بھگ ڈاکٹر گل گرسٹ کی کوششوں سے پہلی بار کلکتہ میں وجود میں آیا تھا ۔ پھر سنگی مطبعات قائم ہونے، مصوری کی جگہ فوٹو گرافی نے لے لی، اس طرح فنون لطیفہ میں سے خطاطی اور مصوری رو بہ زوال ہو کر محض تکملۂ شوق کی حد تک باقی رہ گئی ۔ پہلے ہمارے علوم و فنون کے شہ پارے تمام تر قلمی ہوتے تھے، دیوان خانوں کی آرائش و زیبائش قلمی مخطوطات اور تصاویر سے کی جاتی تھی اب کتابیں پریسوں میں ڈھلنے لگیں، ڈرائنگ روم اور گول کمروں میں جا بجا صرف فوٹو نظر آنے لگے، اس طرح خطاطوں اور مصوروں کو افلاس کا شکار ہونا پڑا، اُن کا وجود برائے نام باقی رہ گیا ۔ اب اگر رسم الخط کی تبدیلی عمل میں آئی تو یہ فن اور اس کے فنکار اور بھی تباہ و برباد ہوجائیں گے ۔

با ایں ہمہ اردو کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنانے کی تجویز پھر بھی ایک قابل قبول تجویز ہوسکتی ہے، کم از کم اسے اختیار کرنے میں ادب اور علم کی کثرت تو نظر آتی ہے لیکن کیا ہمارا ادب اُن علوم و فنون سے قطعاً محروم اور عاری ہے ۔ اگر فی الحقیقت عاری ہے تو جب ہم اسے معقول سرمایہ کو ٹھکرا کر انگریزی کو اپنی قومی و سرکاری زبان بنانے کیلئے تیار نہیں تو پھر انگریزی کی بجائے رومن رسم الخط کی تائید کیوں کر کرسکتے ہیں؟ رومن ٹائپ کے مقابلے میں ہمارا عربی نسخ اور اردو نستعلیق اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ ہم اسے یکسر اور تمام تر ٹھکرا دیں ۔

سابقہ اصلاحات کی روشنی میں اس میں مزید اصلاحات کی جا سکتی ہیں -

ہم اس خیال میں تھے کہ سوال صرف آردو رسم الخط کا ہے لیکن تعلیمی کمیشن کے دوسرے اعلان سے پتا چلا کہ نہیں ، ہمارے سامنے بنگلہ کے لئے بھی رومن رسم الخط کی تجویز زیر غور ہے - لیجئیے یک نہ شد دو شد - جو دوئی ہمیں ہندوستان میں نہ بھائی آج وہی دوسرے روپ میں ہمارے سامنے آئی - اگر یہ ہونی شدنی ہی بات ہے تو پھر یہ صرف دو پر ہی کیوں ختم ہو - اور بھی تو چار بھائی ہیں ان کا پانچواں سوار اور چھٹا سردار بھی ہے ، آخر اس دور جمہوریت میں وہ اس عنایت سے کیوں محروم رہیں -

۱۹۵۱ء کی مردم شماری ، تعداد خواندگی اور زبان کے اعداد و شمار کی رو سے یہ سب منہ بولے بھائی جب " رومن ڈرل ماسٹر " کے سامنے کھڑے ہو کر " لیفٹ رائٹ " کریں گے تو اپنے قد و قامت (بولی) کے اعتبار سے اس طرح کھڑے ہوں گے :-

" بنگلہ ، پنجابی ، اردو ، سندھی ، پشتو ، بلوچی ، فارسی ، عربی "

اس پر ہم سیر حاصل تبصرہ تو آگے چل کر تعلیمی مسائل کے ماتحت کریں گے یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ تعلیمی کمیشن کے اس تازہ اعلان نے کم از کم اس گتھی کو تو سلجھا دیا اور ہمارا یہ شک رفع ہو گیا کہ اگر یہ نوازش بیجا الطاف ظہور میں آئی تو اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ بھی وابستہ ہوگی باقی رہا دوسری زبانوں کا مسئلہ ،

ظاہر ہے کہ جلد یا بدیر اُن کا آشیانہ بھی برق رومن کی نذر ہو جائیگا اردو اور بنگلہ کی طرح اُن میں یہ تاب مقاومت کہاں ؟

اردو ، بنگلہ رومن رسم الخط (بظاہر دوسری زبانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے) کا مسئلہ محض جمع یا تفریق کا سوال نہیں کہ جوڑنے یا گھٹانے کے بعد فوراً حل ہو جائے ۔ یہ تو ایک معمہ ہے سمجھنے اور سمجھانے کا ، ہمیں مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اس کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا ۔ آئیے ہم علیحدہ علیحدہ عنوانات کے ما تحت اس پر کچھ غور و فکر کریں ۔

پاکستان کے بنیادی نظریات

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

آہ شودر (۱) کیلئے ہندوستان غم خانہ ہے
درد انسانی سے اس بستی کا دل ویرانہ ہے
(اقبال رح)

سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھیں کہ زبان کے باب میں ہمارا پاکستانی منشور کیا کہتا ہے یعنی پاکستان کی بنیادی اساس کن نظریات پر قائم کی گئی تھی۔ قائد اعظم رح نے اپنی زبان اور قلم سے بار بار کیا کہا تھا؟ قائد اعظم رح نے قوم کو یہ قول دیا تھا کہ:

(۱) پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان واحد اُردو ہوگی۔
(۲) اردو کے ذریعے تمام صوبہ جات کے باشندوں کو متحد کیا جا سکتا ہے اس لئے اس کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔

---

(۱) بھارت کی نام نہاد سیکولر اسٹیٹ جسطرح ' شودروں ' کو نیچ ذات اور نجس سمجھتی ہے اسی طرح اُس کی نگاہ میں "مسلمان" قوم بھی ملچھ اور ناپاک ہے ۱۲ -

ظاہر ہے کہ جب یہ وعدہ کیا گیا تھا اُس وقت "اردو" رومن رسم الخط میں نہیں تھی بلکہ اپنے پیدائشی عربی رسم الخط سے ماخوذ اردو نستعلیق میں تھی اور اب تک ہے۔ قائد اعظم رحہ نے یہ قول کیوں دیا تھا۔ وقت کے تمام رہنما اس کے حامی، اور غیر منقسم ہندوستان کے مسلم عوام اس کے طلبگار کیوں تھے؟ اس لئے کہ گاندھی جی اپنی پرارتھناؤں میں لارڈ میکالے کا پڑھایا ہوا سبق اپنے چیلوں کو پڑھا رہے تھے۔ ان تمام صوبوں میں جہاں کانگریسی وزارتیں قائم تھیں، واردھا اسکیم، ودیا مندر اور ناگری پرچارنی سبھا کے سنکھ بڑے زور شور سے پھونکے جا رہے تھے۔ ہندوستانی زبان کے پردے میں سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط کو از سر نو زندہ اور مسلمانوں کی زبان، مذہب اور تہذیب کی شدھی کی جا رہی تھی۔ مدارس میں لڑکے لڑکیوں کی تعلیم مخلوط ہو گئی تھی۔ تعلیمی نصاب میں مسلمانوں کی دینیات یکسر غائب تھی، تاریخ کو بھی مسخ کردیا گیا تھا۔ ذریعۂ تعلیم مادری و ملکی زبان کی بجائے سنسکرت تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کیلئے موسیقی اور تصویر کشی عام تھی۔ فریضۂ قربانی کو پاپ اور عقیدۂ جہاد کو اہنسا سے بدلا جا رہا تھا۔ مسلمان بچے ہندو لڑکوں کے دوش بدوش سرسوتی کی پوجا اور ' بندے ماترم ' کا گیت گاتے تھے۔ سلام کی بجائے نمستے اور رام جی کی جے ہوتی تھی۔ غذا میں صرف ترکاری اور دال بھات ملتا تھا، گوشت بالکل غائب تھا۔ اسی طرح لباس میں کلاہ، ٹوپی اور پاجامے کی جگہ گاندھی کھدر کیپ اور دھوتیاں استعمال کرائی جاتی

پہناوے سے لڑکوں میں ھندو اور مسلم کی تمیز قطعاً محال تھی ۔

ان حالات و واقعات سے متاثر ھو کر جب بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے گاندھی جی سے ملاقات کی اور ان باتوں کی طرف توجہ دلائی تو انھوں نے جواب دیا ۔

(۱) ”میں اردو کا اس لئے مخالف ھوں کہ وہ قرآنی زبان میں لکھی جاتی ھے ۔

(۲) اردو (ھندوستانی باشندوں کی بجائے) مسلمان بادشاھوں کی زبان ھے، مسلمان چاھیں تو اسے باقی رکھ سکتے ھیں لیکن ھندوستانی زبان ھندی ھی ھوگی“ (قومی زبان از ڈاکٹر سیتا پوری صفحہ ۳)

ایک مرتبہ نیشنل کالج بہار میں مولانا سلیمان ندوی رح نے فرمایا :

”مجھے بڑا تعجب اُن لوگوں پر آتا ھے جو ھندی اور اردو کو دو الگ الگ زبانیں تو کہتے ھیں لیکن ھندوؤں اور مسلمانوں کو دو جدا جدا قومیں تسلیم نہیں کرتے“

(منشور، دھلی ۲ ۔ مارچ ۴۶ء)

اس کے بر عکس پنڈت نہرو نے کہا :

”یہ اسلامی تہذیب ھے کیا چیز ؟ کیا عربوں ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ھے جو نسلی تعلق کیوجہ سے اب تک

باقی ہے یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی
اور رسم و روایات ہیں،،

(میری کہانی از نہرو صفحہ ۳۳۳)

اور جب سنسکرت کا پرچار کرنے کھڑے ہوئے تو یوں بولے:

"زبان اور رسم الخط کے درمیان بڑا گہرا رابطہ ہے خط کی تبدیلی اس زبان (سنسکرت) کیلئے بڑی اہمیت رکھتی ہے جسکا ماضی شاندار رہا ہو،،

اسی طرح سوامی ستیہ دیو نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں کہا:

"ہندوستان میں ہندو تہذیب ہی کے ذریعہ سوراج قائم ہوسکتا ہے دھرم کی روشنی میں ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کو دنیا سے نابود کردیا جائے اور اس کی جگہ راشٹر دھرم کی تعلیم مسلمانوں کو دی جائے،،

(تیج، دھلی ۲۰ - جون ۱۹۲۴ء)

حقیقت یہ ہے کہ ہندو قوم بہت پہلے سے بیدار تھی اور آج اس سے بھی زیادہ بیدار ہے، اسے اپنی قومیت کا احساس پہلے بھی تھا اور آج بڑی شدت کے ساتھ ہے - قومی تعصب کی اس سے زیادہ انتہا اور کیا ہوگی کہ آج بھارت کے مختلف شہروں میں سڑکوں محلوں کے ناموں کی بھی شدھی شروع ہوچکی ہے مثلاً دھلی میں 'پھاٹک حبش خان، کا نام 'تلک بازار، اور 'سر سید احمد روڈ، کا نام 'پرتاپ روڈ، رکھا گیا ہے خدا کا شکر ہے کہ ہم ایسے بےمعنی تعصب اور سنگدلی کا شکار نہیں مگر اس حماقت سے قطع نظر یہاں یہ

عالم ہے کہ گیارہ سال تک احساس کمتری میں مبتلا رہے، ہمارے سابقہ سیاسی رہنماؤں نے کبھی انگریزوں کی جوتیاں اٹھوائیں، کبھی نہرو کو بڑا بھائی بنایا۔ کبھی پاکستان کے بنیادی نظریات کو ٹھوکر مار کر مخلوط انتخاب کی رٹ لگوائی، کبھی قوم و ملت کے مفہوم کی شدھی کی گئی۔ ہر سال قائد اعظم رح کا یوم پیدائش، یوم پاکستان اور یوم جشن آزادی بڑی دھوم دھام اور کروفر سے منائے جاتے ہیں، اخبار و رسائل میں بڑے زوردار آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ قائد اعظم رح کی آواز میں اُن کے اقوال اور حکیم مشرق ڈاکٹر اقبال رح کے حکیمانہ درس خودی اور پیغام حریت کو ریڈیائی لہریں صبح سے رات تک نت نئے انداز میں کائنات کے ذرے ذرے کو سنا کر عمل کی تاقین کرتی ہیں، لیکن شب کو سونے سے پہلے یہ تمام اقوال اور پند و نصائح طاق نسیاں میں رکھ دی جاتی ہیں اور پوری قوم غفلت کی چادر تان کر سوجاتی ہے۔

ہندوؤں نے اردو زبان اور رسم الخط کو یہ کہکر کہ یہ قرآنی ہے، مسلمان بادشاہوں (ہندوستانی باشندوں کی بجائے) کے عہد غلامی کی نشانی ہے اسکی مخالفت کی اور آج سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط کو ہر حیلے اور ہر بہانے نافذ کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے عہد غلامی کی ایک یادگار زبان انگریزی تو ہم پر پہلے ہی سے مسلط ہے اور شاید آئندہ بیس برس تک مسلط رہے گی۔ اب ایک دوسری یادگار رومن رسم الخط کو اپنانے کی سوچ رہے ہیں اور پھر لطف یہ کہ الٹا ہم ہی کو لکیر کا فقیر بتایا جا رہا ہے۔

بہرحال اب ہمیں دیکھنا ہے کہ صدر اعظم پاکستان جنرل ایوب کے ان واضح اعلانات کو جو انھوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو رائٹرز کنوینشن کراچی اور ۶ مارچ ۵۹ء کو راولپنڈی کے جلسۂ عام میں کئے تھے :-

"تعمیر وطن کے باب میں آدباء کو نہایت اہم خدمت انجام دینا ہے، انھیں روح اسلام کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے تاکہ وہ اپنی منزل مقصود کو جلد از جلد پاسکیں۔

ادیبوں کو چاہیے کہ وہ ادب میں پاکستانی نظریۂ حیات کی تبلیغ پر توجہ دیں اور عوام میں تعمیری انداز فکر پیدا کریں۔

سیاست داں ہمیشہ کیلئے اس ملک سے ختم ہوچکے ہیں وہ اب کبھی برسر اقتدار نہیں آسکیں گے۔ نظریۂ پاکستان کی بنیاد اسلامی ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل کئے بغیر ہم نہ اچھے انسان بن سکتے ہیں اور نہ اچھے پاکستانی۔

(جنرل ایوب)

ہمارے ارباب حل و عقد اور اہل فکر و نظر، ادباء اور شعراء کس طرح عملی جامہ پہناتے ہیں، آئیے اب ہم رسم الخط کے مذہبی پہلوؤں پر کچھ غور کریں:

مذہبی روایات

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
اقبال رح

یہ صحیح ہے کہ زبان انسان کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہے اور رسم الخط تحریر کا ذریعہ، لیکن یہ غلط ہے کہ زبان اور رسم الخط کا کوئی مذ ہب نہیں ہوتا ۔ اس نظریہ کے لئے قرآن مجید کی موجودگی ہی ایک نہایت مسکت جواب ہے، اگر یہ کہا جائے کہ نزول قرآن پاک سے قبل حضرت آدمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ پر جو صحائف آسمانی نازل ہوئے جنکی روشنی میں انجیل، توریت اور زبور ظہور میں آئیں کیا وہ مقدس اور قابل احترام کتب نہیں؟ یقیناً وہ بھی قابل احترام ہیں لیکن تمام تر قابل عمل نہیں کیونکہ اُن مقدس کتب کا موجودہ روپ تحریف شدہ ہے، دوم یہ کہ اُس وقت تک دین اسلام مکمل نہیں ہوا تھا، اگر مکمل ہو چکا ہوتا تو پیغمبر آخرالزماں حضرت صلعم اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی ضرورت کیوں پیش آتی ۔ اگر زبان اور رسم الخط کے درمیان کوئی رشتہ مذہب نہیں

ہے اور نہیں ہوتا تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال گذر جانے کے باوجود (ابتدائی اور جزوی ترمیمات سے قطع نظر) قرآن پاک کی زبان اور رسم الخط اب تک کیوں نہیں بدلا - ان تیرہ سو برس میں دنیا کے ہر ملک اور ہر گوشے میں قرآن مجید کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا اور سیکڑوں تفسیریں لکھی گئیں لیکن کلام الہی کا متن اسی رسم الخط میں رہا جو اس کا قدیم مہذب خط تھا -

فی زمانہ ترکوں کے قول و فعل کو بلاوجہ ضرورت سے زائد سراہا جاتا ہے اور ہر لمحہ اور ہر گام پر ان کی مثال دی جاتی ہے - (١٨٥٧ء) کے ہنگامہ آزادی کے بعد بر اعظم ایشیا کے طول و عرض میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغ عیسائیت کا بڑا زور شور تھا اور مسلمان قدرتاً اس سے بہت متفکر تھے، عیسائیت کے ان حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے وہ بھی اپنی سی سر توڑ کوششیں کر کے نہ صرف اپنا دفاع کر رہے تھے بلکہ جوابی حملوں میں بھی پیش پیش تھے - گارساں دتاسی اپنے خطبات میں ان کوششوں کے متعلق اس طرح لکھتا ہے :

> ”انگریز مشنریوں کو ہندوستانی مسلمانوں میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جتنی ان کو ترکی میں حاصل ہوئی ہے - بہر حال ان کے اثر سے ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کا خیال پیدا ہوگیا ہے“

خطبہ ١٨٦٤ء صفحہ (٣٣٣)

"انگریزی لے ہندوستانی لوگوں کو ذرا نہیں بھاتی، بعض مشنری یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستانی راگوں کے مطابق اپنی دعاؤں کو ادا کریں.... چنانچہ ہندوستانی راگوں کو جو قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں یورپین علامات میں لکھ لیا گیا ہے۔"

خطبہ ۱۸۶۳ء صفحہ (۴۰۰)

ایسی نازک صورت حال میں جب کہ تحریر و تقریر کے علاوہ راگ رنگ کے ذریعے بھی لوگوں کو عیسائیت کی طرف گھسیٹا جا رہا تھا قرآن مجید کے معاملہ میں گارساں دتاسی کے بقول ترکوں کا اعتقاد اور مطالبہ یہ تھا:

"دولت عثمانیہ کے ترکوں کو یہ زبردست اعتراض تھا کہ قرآن مجید جیسی مقدس کتاب کا اُس وقت کی مروجہ زبان ترکی میں ترجمہ کیا جائے لیکن بہر نوع سلطان کے حکم سے وہ ترجمہ شائع ہوا"

خطبہ ۱۸۶۶ء صفحہ (۵۳۳)

ابھی ماضی قریب میں جب ترکی میں یہ تحریک اٹھی اور شائد اب بھی اس پر عمل ہو رہا ہے کہ اذان اور خطبات رسول صلعم ترکی زبان میں ادا کئے جائیں تو اس کے بر خلاف تمام عالم اسلامی بیک وقت چیخ اٹھا۔ اس اذان اور خطبہ کی خواندگی میں تو رسم الخط کا دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ لہذا

یہ کہنا کہ زبان اور رسم الخط کا کوئی مذہب نہیں ہوتا کہاں تک حق بجانب ہے ۔ یہ انگریزی تہذیب ، انگریزی زبان اور رسم الخط کے کرشمے نہیں تو اور کس کے ہیں ؟

مفتی اعظم فلسطین نے کراچی کے ایک پرائیویٹ جلسے میں فرمایا :

”میں نے ملک شام میں ایک جگہ ایک نمائش گاہ میں چند خرگوشوں کو دیکھا اُن میں سے ایک خرگوش دوسرے خرگوش کو مار مار کر اپنے گھر سے نکال رہا تھا ۔ میں نے اُس کے محافظ سے اس کی وجہ دریافت کی تو اُس نے جواب دیا کہ مارنے والا خرگوش اعلیٰ نسل سے ہے اور دوسرا کمتر نسل کا، اس اعلیٰ نسل والے کو کمتر نسل کی قربت پسند نہیں“

یہ چشم دید واقعہ سنا کر مفتی اعظم نے اہل محفل سے کہا جس میں یہ راقم الحروف بھی شامل تھا :

”صاحبو ! دیکھئے حیوانات تک میں نسل کی برتری اور کمتری کا احساس موجود ہے ، ہم اشرف المخلوقات اور اشرف الامت ہوتے ہوئے بھی اس احساس سے بے بہرہ ہیں ، میں حیران ہوں کہ ہم لوگ کس طرح اپنے بچوں کو کلیسائی مدارس میں بے تکان بھیج دیتے ہیں اور پھر اُن کے لامذہب اور بے دین ہونے کا شکوہ بھی کرتے ہیں ۔“

یہ تبصرہ بر صغیر ہند و پاک کے کسی دقیانوسی کٹ ملا کا نہیں، تمام ممالک اسلامیہ کے مسلمہ مفتی اعظم کا ہے، لیکن ہم ترکی تہذیب پر اعتراض کرنیوالے کون؟ ہمیں سمندر پار ایک پرائے گھر کی معاشرت سے کیا واسطہ، اور اگر اسلامی نقطۂ نظر سے ہمیں تنقید کا کوئی حق پہنچتا ہے تو ہمیں چاہئے کہ پہلے ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہمارا اپنا مذاق اور شوق و رحجان کیا ہے۔ مغرب کی تقلید نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

آج کے مغرب زدہ والدین کو جنہیں محض نام کے اعتبار سے مسلم ہونے کی سند حاصل ہے اپنے بچوں سے اپنے آپ کو ابا یا ابو اور اماں یا امی سنکر شرم آتی ہے، اس کی بجائے ڈیڈی، یا ممی، سنکر خوش ہوتے ہیں، اسی طرح چچا اور چچی کو انکل اور آنٹ کہلوایا جاتا ہے، بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ان معصوم اور سادہ لوح بچوں کو مغربی لباس پہنا کر گانے اور ناچنے کی تعلیم دلوا کر باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہے اور جب یہ بچے اپنے ماں باپ اور عزیزوں کے روبرو تھرک تھرک کر ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار، یا کوئی تازہ فلمی نغمہ الاپتے ہیں تو گھر والوں کی باچھیں خوشی سے کھل جاتی ہیں، تالیاں بجا بجا کر چیئرز دیتے ہیں۔ پھر یہی بچے بڑے ہوکر نا محرموں کے ساتھ ڈرنک اور ڈانس کرتے ہیں۔ شادی سے پہلے علی الاعلان کورٹ شپ مناتے ہیں۔ اسے

انکی فطری آزادی اور شخصی حق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ موڈرن مسلمان اسلامی تہذیب کے منہ پر یہ کہہ کر طمانچہ لگاتے ہیں: ”دیکھو یہ ہے ہماری موڈرن تہذیب کا اعلیٰ شاہکار“ مولانا ظفر علیخاں مرحوم کو نہ معلوم کیا سوجھی ایک مرتبہ بہت ہی بری طرح بگڑ بیٹھے اور جھنجھلا کر فرمایا:

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
کہ اس حرمزادی کا حلیہ بگاڑ دے

کہا جاتا ہے کہ مصطفیٰ کمال نے رجعت پسند ملائیت کا خاتمہ کردیا۔ بلا شبہ ایسا ہوا لیکن اس کی قاطع رسم الخط کی تلوار نہ تھی بلکہ وہ سقوط خلافت عثمانی تھا جو شہنشائیت، آمریت اور استبداد کی شکل میں بنو امیہ اور بنو عباسیہ سے منتقل ہو کر آل عثمان میں آیا تھا اس وقت کی سیاسی بازی گری نے حجاز، عراق اور مصر کو خود مختار بنا کر مسند خلافت کی تیرہ سو سالہ شوکت و ہیبت کو پہلے ہی سے ختم کر دیا تھا۔ چار و ناچار مصطفیٰ کمال نے بھی (۱۹۲۴ء) میں اس پر سقوط کی قانونی مہر ثبت کرکے یہ اعلان کردیا کہ ہم پہلے ترک ہیں اور بعد میں مسلمان۔ چنانچہ آج بھی ترکوں کا یہی نعرہ ہے۔ ڈاکٹر اقبال رحہ نے اسی سقوط خلافت پر تو فرمایا تھا:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

در اصل ترکی جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے بہت قریب ہے، دوسرے یہ کہ ترکی زبان کے حروف تہجی میں کوئی حرف ایسا نہیں جس کا لاطینی ابجد میں وجود نہ ملتا ہو لیکن اس قربت اور مماثلت کے باوجود رومن رسم الخط اختیار کرنے پر ترکی زبان کو دیگر بلاد عالم میں فروغ تو کجا بر صغیر ہند و پاک میں بھی آج تک کوئی نہیں جانتا، یہاں کے عوام تو الٹا یہ کہتے ہیں : ع

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس کے بر عکس جس طرح عربی رسم الخط نے پہلوی زبان کی ظاہری صورت و شکل اور ایرانیوں کے مزاج اور روح تک کو بدل ڈالا، اسی طرح لاطینی رسم الخط کی بدولت آج کا ترکی اپنے تمام صحافتی اور ثقافتی سرمایہ سے محروم ہوکر مغربی تہذیب و تمدن کا شکار ہوگیا۔ مادی اعتبار سے بھی ترکی نے صنعت و حرفت میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی اور ممالک کا تو ہم کو علم نہیں لیکن ہمارے پاکستان میں ترکی ساخت کی ایک معمولی پنسل یا بلیڈ تک نہیں ملتا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر ہم نے رومن رسم الخط اختیار کر لیا تو بہت سے ممالک پاکستان کے ہمنوا ہوجائیں گے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہندوستان کی تقسیم ہی ظہور میں کیوں آتی۔ بھارتی لیڈروں نے مذہبی اساس ہی پر تو یہ کہا تھا کہ اردو زبان اور اسکا رسم الخط مذہبی اور قرآنی ہے اور سنسکرت اور دیوناگری رسم الخط دیوتاؤں کی زبان اور

تحریر ہے ۔ بھارت بھی تو ہماری طرح امن اور اتحاد کا علمبردار ہے پھر وہ اپنی قدیم زبان اور رسم الخط آج کیوں رائج کر رہا ہے ، رومن رسم الخط کیوں اختیار نہیں کرتا ؟ باقی رہے ممالک اسلامیہ جہاں عربی رسم الخط کے علاوہ لاطینی کا بھی رواج ہے تو کیا وہ لاطینی رسم الخط کی وجہ سے ہمارے ہم خیال اور ہم نوا ہیں اور ہمنوا ہوجائیں گے ، یا اسلامی رشتۂ اخوت کے لحاظ سے ہمارے بھائی کہلاتے ہیں اور ہمارے بھائی بن سکتے ہیں ۔ اسلامی مملکت مصر کو لیجئے جہاں عربی نسخ میں اس کا ٹائپ اور ٹیلی پرنٹر دونوں موجود ہیں ، وہ ہمارے ہم مذہب بھی ہیں لیکن اس کے باوجود کلیتاً ہم سے اتفاق نہیں رکھتے ۔ ان اسلامی ممالک کے لئے قرآن مجید کی تعلیم اور عربی رسم الخط کی دلیل دی جاتی تو واقعی سمجھ میں آنے والی بات بھی تھی کہ اُسکا پڑھنا لکھنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا دنیا کے ہر مسلمان کا بنیادی اور یکساں فریضہ ہے ۔

ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن پاک کی عظمت اور احترام فی الاصل اس کے اصول اور احکام ماننے میں ہے لیکن یہ بات صرف اسی حد تک درست ہے ۔ سوال یہ ہے کہ ان احکام کا اُس وقت کیا حشر ہوگا جب آپ سرے سے قرآنی زبان اور رسم الخط ہی کے منکر ہوجائیں اور آپ کا مطالبہ یہ ہو کہ ہم تو رومن رسم الخط ہی میں کلام الٰہی پڑھیں گے ۔ رسم الخط اس لئے بحث میں آتا ہے کہ وہ زبان (جو کامِ و دہن کی اصوات

کا نام ہے) کی ادائیگی کا واحد ذریعہ اور وسیلہ ہے ۔ موجودہ اعراب اسی لئے وجود میں آئے کہ ان کے بغیر قرآن مجید کا صحیح تلفظ ادا کرنا دشوار تھا ۔ ان اعراب یا تلفظ کی غلطی بعض اوقات کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے ۔ رومن رسم الخط اس کی صحت کے لئے قطعاً ناموزوں ہے ۔ قرآن مجید یا عربی زبان ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کی ہر زبان کا یہی حال ہے ۔ اپنے ملک کی زبان بولنے والا دوسرے ملک کی زبان کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہے ، کیونکہ قدرتی طور پر آب و ہوا کے اختلاف کے باعث ہر انسان کے عضلات دہن جدا جدا اصوات ، لب و لہجہ اور تلفظ رکھتے ہیں ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا قرآن پاک تو ایک ہی ہے لیکن ہر زبان میں اس کے تراجم اور تفاسیر الگ الگ ہیں ۔ آج اردو میں اسلام پر جس قدر کتابیں موجود ہیں شاید عربی فارسی میں بھی اتنی نہ ہوں گی ان تراجم کی بوقلمونی اور تفاسیر میں تاویلات کی نیرنگی نے ہمارے درمیان مشہور ۷۲ فرقوں کو جنم دیا اور تفرقے پھیلائے ۔ حضرت اقبال رح نے کیا خوب فرمایا ہے :

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پاژند

اب اگر ان تراجم اور تفاسیر کو رومن رسم الخط میں تبدیل کیا گیا اور کرنا پڑے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لکھا ہوا کچھ اور ہوگا اور پڑھا کچھ اور جائیگا ۔ اسطرح

قرآن مجید کے سیکڑوں مفہوم اور مطالب ہوجائیں گے اور یہ فرق نئے ۲۷ فرقوں اور ہزاروں فتنوں کو پیدا کرے گا۔ دین محمدی صہ ایک کھلونا بنکر رہ جائیگا اسی لئے تو آنحضرت صلعم نے عالمگیر قومیت کیلئے ہر چیز میں یکتائی اور وحدت کا جلوہ پیش کیا ورنہ اسلام کا بول بالا کیونکر ہوتا۔ اگر یہ کہاجائے کہ رومن رسم الخط کو اصلاح کے بعد رائج کیا جائیگا تو کیا اردو رسم الخط میں اصلاح کرنا کوئی عیب یا گناہ ہے؟

تعلیمی مسائل

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اقبال رح

یہ ہمارا روز مرہ کا عینی مشاہدہ ہے کہ جب کسی مسلمان گھر میں کوئی نو مولود ہوتا ہے تو بطن مادر سے پیدا ہوتے ہی اس کے کانوں میں اذان دیجاتی ہے ۔ اس سرگوشی میں سب سے پہلے جو آواز نو مولود کے کانوں میں باقاعدہ داخل ہوتی ہے وہ لفظ ''اللہ'' ہوتا ہے ، زمانہ پرورش میں بھی اسے ''اللہ اللہ'' کی لوریاں دے کر دودھ بھری کٹوریاں پیش کی جاتی ہیں ۔ پھر اس کی تعلیم کا آغاز بھی قرآن مجید کی آیت ''اقرا باسم ربک الذی خلق'' ہی سے ہوتا ہے ۔ اسی اسلامی عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد بھی ہماری زبان عربی ہوگی ۔

اس تمہید سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم آپ کے روبرو عہد قدیم کے اسلامی یا غیر اسلامی مکاتیب کی پوری تاریخ دھرائیں ، مدعا صرف یہ ہے کہ اگر یہ تعلیم رسمہ اول اور فریضہ مذہبی نہ ہوتا تو مسلمان بچوں کے ابتدائی سلسلۂ قرآن مجید یا عربی خواندگی میں کیوں صرف ہوتے

اور وہ دوسری اقوام سے تعلیم میں نسبتاً کیوں پیچھے رہتے
یوں تمام دنیا میں ناخواندہ موجود ہیں ، کہیں کم ، کہیں
زیادہ اور کہیں بہت زیادہ۔ ابتدا میں بچہ ہو یا ناخواندہ بالغ
اسے صرف حرف شناسی اور صحیح تلفظ ادا کرنے کی تعلیم دی
جاتی ہے پھر الفاظ کے معنی کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے کی مشق
کرائی جاتی ہے ۔ گویا تلفظ سے کسی وقت اور کسی حالت
میں بھی مفر نہیں ۔

ماہران تعلیم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ بچے
اور نوخواندہ بالغان اپنی مادری زبان بہت جلد سیکھ جاتے ہیں
لیکن جب انہیں اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کی
تعلیم غیر زبان میں دی جاتی ہے تو ان کے دل و دماغ پر
دوگنا بار پڑتا ہے ۔ اس مثال سے ہم با آسانی اس عظیم دشواری کا
بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جو ایک محض اجنبی اور نا آشنائے زبان
کو کسی غیر زبان کی تعلیم دینے میں پیش آتی ہے ، بس
یوں سمجھئے جیسے کسی گونگے پر عمل جراحت کرکے اسے
گویائی بخشنا ۔ چنانچہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں بھی
یہ خرابی موجود ہے کہ ابتدا میں اردو، درمیان میں انگریزی
(جسے مقام تو نمایاں حاصل ہے لیکن انتظام معقول نہیں)
اور میٹرک کے بعد تمام تر انگریزی میں تعلیم دیجاتی ہے ۔
اس بنیادی کمزوری کے باعث ۸۰ فیصد طلبا صرف انگریزی
میں فیل ہوتے ہیں ۔ ان کو صحیح معنوں میں کسی ایک
زبان پر بھی دسترس حاصل نہیں ہوتی ۔ جہاں تک ہماری اپنی
زبان کے تلفظ کا تعلق ہے تو کسی ناخواندہ یا زبان داں سے

(روزمرہ اور مخصوص محاوروں کو چھوڑ کر کہ وہ آسکی لا علمی یا کم علمی کی دلیل ہے) تلفظ کی اس قدر غلطیاں نہیں ہوتیں جسقدر دوسری زبان کے الفاظ ادا کرنے میں آس سے سرزد ہوتی ہیں۔

انگریزوں کا اردو تلفظ اسی لئے غلط ہوتا ہے کہ وہ آسے رومن رسم الخط کے ذریعے سیکھتے ہیں، اگر آپ کسی مستند انگریزی لغت کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو ہر لفظ کے ساتھ اس کا صحیح تلفظ ٹکڑوں میں لکھا ہوا نظر آئیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رومن رسم الخط تلفظ کی ضمانت اور کفالت نہیں کرتا ہر زبان کے حروف ابجد مقرر ہیں جن کے ذریعے با آسانی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کون سا لفظ کس زبان کا ہے۔ رومن املا میں تمام حروف مخلوط ہو جانے کے باعث زبان کی تمیز مفقود ہو جاتی ہے لہذا ایسی صورت میں کسی لغت کا انتخاب بھی ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں خود انگریزی زبان میں الفاظ کے ہجے اور اصوات حروف کا فرق عظیم بجائے خود ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لئے انگریزی میں کوئی مخصوص قاعدہ مقرر نہیں بلکہ آسے ایک ضابطے کی حیثیت حاصل ہے اور پھر اس میں بھی آئے دن تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جسکا ثبوت وہ ضمیمے ہیں جو مستند نئی لغات میں شامل کئے جاتے ہیں۔

آنجہانی برنارڈ شاہ نے انہی دشواریوں کے پیش نظر اپنی زندگی میں کافی غور و خوض کے بعد تقریباً سات سو الفاظ وضع کرکے ماہرین السنہ انگریزی کے حوالے کئے تھے اور

یہ رائے دی تھی کہ ان مجوزہ الفاظ کی اساس پر انگریزی زبان کی از سر نو تشکیل کی جائے۔ اس مشورے میں یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ مستقبل میں ہر آواز کے لئے ایک مستقل حرف ایجاد کیا جائے۔ مرنے کے بعد جب برنارڈ شاہ کا وصیت نامہ سامنے آیا تو اس میں بھی قوم کے نام یہی وصیت درج تھی۔ چنانچہ ایک مدت سے ماہران السنۂ انگریزی کی ایک جماعت انگریزی ابجد اور اپنا نیا رسم الخط رائج کرنے کیلئے غور و فکر کر رہی ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ عنقریب ایک دو سال ہی میں بر آمد ہونے والا ہے۔ اب ذرا ہمارا پرواز خیال و شوق ملاحظہ ہو کہ ہم اپنے مرصع، مہذب اور مکاف خط سے آنکھیں پھیر کر صدہا برس کے اس رومن رسم الخط کو آج ایسے وقت اپنانے کی سوچ رہے ہیں جب کہ اس کا تابوت نکلنے والا ہے۔ ترقیٔ معکوس شاید اسی کو کہتے ہیں۔ اس سے تو ہزار درجہ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنی تمام ملکی زبانوں اور رسوم الخط کو ''اٹلانٹک اوشن،، میں غرق کر دیں اور انگریزی کو اختیار کر لیں، ورنہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ ہم اپنے خط میں اپنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے ما تحت ضروری اصلاحات کرکے اسے اپنی مرضی کے مطابق پہلے سے زیادہ آراستہ کرلیں۔

رومن رسم الخط کے نقائص اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ انہیں با آسانی شمار کیا جاسکتا ہے یہاں ہم صرف ان نقائص کو پیش کریں گے جن کا تعلق زیادہ تر ہمارے مسائل سے ہے:۔

(۱) ھندی اور لاطینی حروف بائیں سے دائیں اور چینی اوپر سے نیچے کی طرف لکھے جاتے ھیں، یہ عمل قانون فطرت کے خلاف ھے ۔

(۲) السنۂ عالم کے الفاظ کی ایک تہائی تعداد ماھرین السنہ کی متفہ رائے کے مطابق صرف اصوات کی مرھون منت ھے لہذا اگر رومن رسم الخط اختیار کیا گیا تو عربی، فارسی، اردو اور ھندی الفاظ کے تلفظ کا صوتی حسن داغدار اور معنوی تنوع یکسر غارت ھوجائے گا اور یہ لسانی اعتبار سے ایک زبردست المیہ ھوگا ۔

(۳) اردو کے مقابلے میں رومن روانی کے ساتھ پڑھنے کے لئے ایک مدت درکار ھوگی ۔

(۴) اردو میں ھر لفظ حروف تہجی کے قواعد پر لکھا جاتا ھے ۔ ھر شخص ایک ھی ھجے لکھے گا اور آپ سے کوئی بدل نہیں سکتا ۔

(۵) رومن کے مقابلے میں اردو حروف کم جگہ لیتے ھیں، اردو شارٹ ھینڈ کا درجہ بھی رکھتی ھے اس کا علم بھی اردو میں موجود ھے ۔

(۶) تمام کتب بالخصوص درسی کتابوں کا حجم بڑھ جائے گا ۔ حجم کے ساتھ ساتھ ھر چیز میں اضافہ ھوگا اسی اضافے کی بدولت کتابوں کی قیمت کم از کم ڈیوڑھی یا دوگنی ھوجائے گی ۔

(۷) تعلیمی نصاب میں خوشخطی کا بھی ایک خاص مقام ھے، اس کی معراج خطاطی ھے اور اس کا شمار فنون لطیفہ میں ھوتا ھے ۔ یہ بھی بالکل نیست و نابود ھوجائے گی ۔

(۸) پرائمری جماعتوں کے اساتذہ اور طلبا دونوں کو پہلے انگریزی اور رومن رسم الخط کی تعلیم حاصل کرنی ہوگی ۔ اس کے بعد عربی، اردو یا انگریزی پڑھانے اور پڑھنے کی نوبت آئے گی، اس طرح طالب علم کی ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ برباد ہوجائے گا ۔ اگر قرآن مجید کی تعلیم علیحدہ دی گئی تو وہ زمانہ علیحدہ رہا ۔ علاوہ ازیں انگریزی پڑھ لینے کے بعد رومن رسم الخط کی حیثیت اور ضرورت کیا باقی رہتی ہے ۔

(۹) اردو زبان میں قریب قریب تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہیں ۔ ہماری زبان میں صرف تین حروف علت ہیں، تمام حروف کا تانا بانا انہی حرکات ثلاثہ پر موقوف ہے ۔ اس کے بر عکس انگریزی حروف علت پانچ ہیں ۔ اصوات کو واضح کرنے کے لئے رومن رسم الخط میں مزید علامات اور نئی علتیں اختیار کرنی پڑیں گی پھر بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہماری ضروریات کے لئے کافی ہوں گی یا نہیں لہذا رومن رسم الخط اختیار کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی تمام زبانوں کو بگاڑ کر ان کا روپ کھودیں ۔

(۱۰) تمام ممالک کی رائج الوقت زبانوں کی لغات کو رومن رسم الخط کی بنیاد پر از سر نو مرتب کرنا پڑے گا اس لحاظ سے مختلف علوم و فنون کی جو اصطلاحات اردو قالب میں اب تک ڈھل چکی ہیں اور ڈھل رہی ہیں زندہ درگور ہوجائیں گی ۔ وہ، اردو قاموس اور

عالمگیر اردو لغت جسے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اور آکسفورڈ ڈکشنری کے پیمانے پر لاھور اور کراچی میں ترتیب دیا جا رھا ھے محض ایک دفتر بےمعنی ثابت ھوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر اس 'ترقیٔ اردو بورڈ'، 'اردو ٹرسٹ'، 'اقبال اکیڈمی'، اور دیگر نیم سرکاری علمی اداروں کے قیام اور اُن پر قوم کا لاکھوں روپیہ صرف کرنا کہاں تک جائز اور سودمند ھوسکتا ھے۔

• ھماری تعلیمی پستی کی واحد وجہ ھمارا ناقص نظام تعلیم ھے اور اس نظام تعلیم میں انگریزی سب سے بڑا سنگ راہ ھے۔ ھمارے ارباب حل و عقد ھمیشہ سے یہ کہتے چلے آرھے ھیں اور آج بھی بڑی آزادی اور بےفکری کے ساتھ اردو کے خلاف یہ فتویٰ صادر کرتے ھیں کہ اردو ابھی اس قابل نہیں ھے کہ اُسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ اول تو یہ دعویٰ ایک بہت بڑی حد تک غلط ھے اور اگر اتمام حجت کے لئے ھم اسے بادل ناخواستہ تسلیم بھی کرلیں تو سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ حکومت نے اسے اس قابل بنانے کی سرکاری پیمانے پر کبھی کوئی کوشش بھی کی۔ کبھی عوام کی اُن کاوشوں کو بھی سراھا جو اپنی بساط سے بڑھکر اپنے محدود ذرائع سے اس کی ترقی اور نشو و نما کے لئے کر رھے ھیں اور شب و روز اسی میں منہمک ھیں۔

کہا جاتا ھے کہ رومن رسم الخط کی وجہ سے اردو اور بنگلہ کا جھگڑا مٹ جائے گا یہ اردو اور بنگلہ کا جھگڑا بھی عوام کا پیدا کردہ نہیں بلکہ سابقہ سیاسی حکمرانوں کا ھے۔

انھوں نے اپنے اقتدار اور نفع کی خاطر یہ تفرقہ ڈالا تھا۔ عوام چاھتے تو مشرقی پاکستان کو جو اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے پہلے ھی سے علیحدہ ھے سیاسی طور پر بھی پاکستان کے دو ٹکڑے کر ڈالتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ کبھی ایسا ھوگا۔ اگرچہ یہ کوئی خوبی کی بات نہیں لیکن بعض اوقات بدرجۂ مجبوری ایک ملک میں دو سرکاری زبانیں بھی ھو جاتی ھیں اگر یہ خیال ھے کہ رومن رسم الخط اردو کو ختم نہیں کرسکتا ، اردو کی حثیت باقی رھیگی تو پھر اسی نظریہ کے ماتحت بنگلہ بھی رومن رسم الخط میں آجانے کے بعد بنگلہ ھی رھے گی ۔ لہذا اردو اور بنگلہ کا اگر کوئی جھگڑا موجود ھے تو وہ رومن رسم الخط اختیار کرنے کے بعد بھی جوں کا توں باقی رھے گا ۔ اور یہی صورت پاکستان کی باقی ماندہ زبانوں کی ھوگی ۔

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی روشنی میں اندازہ لگائیے کہ اردو اور بنگلہ کی ترقی تو ایک طرف رھی ھماری مجموعی جہالت کو دور کرنے کے لئے ھماری سابقہ حکومتوں نے ھماری تعلیمات پر کس قدر توجہ کی اور ھم میں سے کتنوں کو تعلیم یافتہ بنایا :-

آبادی

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

مسلمان	تعداد	
مغربی پاکستان میں :	3,27,32,000	
مشرقی پاکستان میں :	3 22,27 000	کل 6,49,59,000
کاسٹ ہندو	**تعداد**	
مغربی پاکستان میں :	1,62,000	
مشرقی پاکستان میں :	41.87.000	کل 43,49,000
شیڈول کاسٹ	**تعداد**	
مغربی پاکستان میں :	3,69,000	
مشرقی پاکستان میں :	50,52,000	کل 54,21,000
عیسائی	**تعداد**	
مغربی پاکستان میں :	4,34,000	
مشرقی پاکستان میں :	1,07,000	کل 5,41,000
دیگر اقوام ممالک غیر :		5,72,000
		7,58,42,000

پاکستان میں مروجہ زبانیں اور ان کا رسم الخط

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

نمبر	زبان	رسم الخط	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان	کل پاکستان
۱	بنگالی	دیوناگری	11,769	4,12,80,220	4,12,91,989
۲	پنجابی	اردو	2,14,58,282	8,533	2,14,66,815
۳	اردو	اردو	49,55,971	4,63,160	54,19,131
۴	سندھی	نسخ	43,50,938	8,349	43,59,287
۵	پشتو	نسخ	35,86,545	3,081	35,89,626
۶	انگریزی	لاطینی	8,27,361	5,50,206	13,77,567
۷	بلوچی	نسخ	10,75,570	429	10,75,999
۸	فارسی	اردو	2,01,821	25,454	2,27,275
۹	عربی	نسخ	23,825	41,218	65,043

اُن سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں کل پاکستانؑ میں با اعتبار بولی بنگالی زبان بولنے والوں کی تعداد ۴ کروڑ ۱۲ لاکھ ۹۱ ہزار ۹۸۹ یعنی تقریباً نصف ھے، باقی نصف آبادی نقشہ کے مطابق دوسری زبانیں بولتی ھے جس میں انگریزی چھٹے نمبر پر آتی ھے، انگریزی بولی بولنے والوں کی تعداد کل ۱۳ لاکھ ۷۷ ہزار ۵٦۷ ھے۔

جہاں تک رسم الخط کا تعلق ھے اسکا انحصار ھمارے معیار خواندگی پر ھے، آئیے ھم دیکھیں کہ (۱۹۵۱ء) میں ھمارا معیار خواندگی کیا تھا۔

(۱)

پاکستان کا معیار خواندگی بحیثیت مجموعی

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

مرد	تعداد	
مغربی پاکستان میں :	33,05,016	
مشرقی پاکستان میں :	65,95,346	کل 99,00,362

عورت	تعداد	
مغربی پاکستان میں :	17,97,418	
مشرقی پاکستان میں :	22,60,233	کل 40,57,651

کل خواندہ مرد و عورت : 1,39,58,013

(۲)

پاکستان کا معیار خواندگی ، ریاستوں اور صوبجات میں

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

صوبہ یا ریاست	اوسط آبادی	اوسط خواندگی
	ہزاروں میں	
مشرقی پاکستان	16.9	71.08
پنجاب	10.2	19.28
ریاست بھاولپور	6.0	1.10
صوبہ سرحد شمال مغربی	7.8	2,51
" قبائلی	1.3	.33
سندھ	10.8	5.02
ریاست خیرپور	8.8	.28
بلوچستان	8.2	.51
ریاستہائے بلوچستان	2.2	.12
کراچی	31.3	8.51
کل پاکستان	[illegible]	[illegible]

اسی ضمن میں ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مختلف ممالک کی حکومتیں اپنی قومی تعلیم پر کس قدر خرچ کرتی ہیں اور اُن کے مقابلے میں ہماری سابقہ حکومتوں نے اس معاملہ میں کتنی دریا دلی سے کام لیا تھا یہ موازنہ صرف چند ممالک کے اعداد و شمار پر مشتمل ہے :

امریکہ	اپنی آمدنی کا	۱۶	فیصد	اپنی تعلیم پر	خرچ کرتا ہے -
جرمنی	"	۱۵	فیصد	"	"
جاپان	"	۱۴	فیصد	"	"
روس	"	۱۱	فیصد	"	"
بھارت	"	۷	فیصد	"	"
پاکستان	"	۵	فیصد	"	"

ہماری آمدنی کے مقابلہ میں یہ ۵ فیصد صفر کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے ہماری اوسط خواندگی صرف ۵ فیصد ہے جبکہ دوسرے ممالک کی اوسط خواندگی ۹۰ فیصد تک پہنچتی ہے، کیا یہ صورت حال انتہائی افسوسناک اور قابل اصلاح نہیں ؟

آئیے اب ہم رسم الخط کے زاویۂ نگاہ سے اُن اعداد وشمار پر غور کریں - ان اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام پاکستان میں نوشت و خواند (اعلیٰ و ادنیٰ تمام زبانوں میں) سے واقف کل ایک کروڑ ۳۹ لاکھ ۵۸ ہزار اور ۳۱ مرد و عورت ہیں، جن میں تقریباً نصف کروڑ ناگری اور باقی اردو نستعلیق اور عربی نسخ رسم الخط استعمال کرتے ہیں - آخرالذکر نصف تعداد میں انگریزی

لکھنے پڑھنے والے بھی شامل ہیں جن کی تعداد انگریزی بولی کی بنیاد پر کل مغربی و مشرقی پاکستان میں صرف ۱۳ لاکھ ۷۷ ہزار ۵۶۷ ہے ۔ مانا کہ ان تقریباً ۱۴ لاکھ نفوس کا دن رات اوڑھنا اور بچھونا گو انگریزی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی جانب سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عربی نسخ اور اردو نستعلیق سے قطعی نا آشنا یا مستغنی ہیں اور اگر ہوں بھی تو انکی تعداد اس قدر قلیل ہوگی جو ناقابل اعتنا ہے لہذا اس لحاظ سے ساڑھے سات کروڑ کی آبادی میں صرف ۱۴ لاکھ اشخاص انگریزی زبان اور لاطینی رسم الخط کے خواہاں اور دلدادہ ہیں۔ کیا ہمارے انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ صرف ان ۱۴ لاکھ باشندوں کی خواہش کو مان کر سوا سات کروڑ (مغربی و مشرقی) یا سوا تین کروڑ مغربی پاکستانیوں کے مطالبہ کو حقیر سمجھکر ٹھکرا دیا جائے ۔

صرف اس لئے ہمارے سابقہ انگریزی آقا اور ان کے ہم نژاد ہم مسلک امریکی خداوندان نعمت مختلف منصوبوں کے ماتحت تھوڑا یا بہت کچھ دے رہے ہیں اور کچھ دے کر ہم سے ہمارا مذہب ، ہماری تہذیب ، ہماری زبان ، ہماری ثقافت اور ہمارا سب کچھ در پردہ اپنی حکمت عملی سے لے لینا چاہتے ہیں ۔ تاکہ آنکی شہنشاہیت اور سامراجیت ہمیشہ کیلئے آن کے حق میں محفوظ ہو جائے ، ہم ان کے اشاروں پر ناچتے اور تھرکتے رہیں ، آخر کیوں ؟

اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(اقبال رحہ)

قدرت نے اسلام کی فطرت میں لچک دی ہے جتنا اسے دبایا جائے گا اتنا ہی یہ اُبھرے گا ۔ اقبال رحہ اپنی کشت ویران سے نا امید نہ تھا ۔ وہ دانائے راز اس علت اور حقیقت سے واقف تھا کہ حکومت کے زائد لگان ، زمینداری کی اجارہ داری اور ظلم نے اس مٹی کی نمی کو چوس کر اُس کی زرخیزی کو لوٹ لیا ہے ۔ اب ایقان کا آپ نے خود مشاہدہ کر لیا کہ جب 'ساقی' نے توجہ کی ، اپنے فیض عام کو ہر ایک کے لئے بقدر ظرف و جام مقرر کیا تو اُس کی نمی عود کر آئی ۔ اب زرخیزی سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے ۔ جب صدیوں کی یہ سنگلاخ داروگیر اُن کی آن میں مٹ گئی تو رسم الخط اور اس منہ بولی ، بولی کا معاملہ تو اپنے دل کا معاملہ ہے ایک ہی نظر اور ایک ہی بول میں طے پا سکتا ہے ۔

طبیہ کالج دہلی ۔ میڈیکل کالج آگرہ ۔ انجینئرنگ کالج رڑکی و کلکتہ ۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔ جامعہ عثمانیہ دکن ، ان تمام جامعات نے عرصۂ دراز تک سائینسی ٹکنیکی مضامین کی تعلیم ہماری مادری زبان اردو میں دی ۔ اس وقت کراچی میں بھی اس کی زندہ مثال ، 'اردو موجود ہے ۔ زندہ دلانِ پنجاب ، باغبان اردو ، سات ہزار اصطلاحات علمیہ اور دفتری الفاظ وضع اور ترجمہ

کر چکے ھیں ۔ دارالترجمہ عثمانیہ، دکن اور دیگر ماھران علوم کی توجہ سے مختلف علوم و فنون کی ھزاروں کتابیں اردو میں منتقل ھوچکی ھیں ۔ اس سرمایہ میں روز بروز اضافہ ھو رھا ھے ۔ کیا ھماری یہ کوشش، کاوش اور کاھش قابل اعتنا نہیں؟

ان نتائج اور نظائر کی موجودگی میں اگر اب بھی آپ یہ فرمائیں کہ اردو زبان اور اسکا رسم الخط ناقص اور غیر مہذب ھے اور ذریعہ تعلیم اور دفتری زبان نہیں بن سکتا تو سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ھے کہ:

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تعلیمی کمیشن کے روبرو ھماری سالانہ اوسط پیدائش و اموات نیز پاکستان اور تمام ممالک کے تعلیمی اعداد و شمار موجود ھیں ۔ ان کو بخوبی علم ھے کہ پرائمری سے ڈگری کالج اور یونی ورسٹیوں تک ساڑھے سات کروڑ نفوس میں سے کتنے خوش نصیب ایسے ھیں جو علم کی دولت حاصل کر چکے اور کتنے زیر تعلیم ھیں اور کتنے نونہال اور نوجوان ایسے ھیں جو مدرسوں اور کالجوں میں داخل ھونے والے ھیں یا داخل ھونا چاھتے ھیں لیکن ان کے ماں باپ اور سرپرستوں کی اقتصادی پستی، درسگاھوں کا فقدان، انکی اس آرزو کے مانع ھے ۔ ھم اس وقت کتنی درسگاھوں کے مالک ھیں، یہ درسگاھیں کس حد تک ھماری تعلیمی ضروریات کی کفیل ھیں ۔ ھمارے فاضل پروفیسروں اور اساتذہ کی موجودہ تعداد کیا ھے، ان میں سے کتنے ملکی ھیں اور کتنے غیر ملکی

اپنے کتنے ہی لائق جوہروں کو ٹھکرا کو جرمنی سے جرمن پروفیسروں کی کھیپ یہاں کیوں لائی جا رہی تھی -

اسلاف پرستی کا آج دنیا میں کوئی قائل نہیں، ہم بھی اس کے حامی نہیں لیکن مرحوم بزرگوں کی اعلیٰ روایات کو فراموش کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے، ان کے کارناموں کو تازہ اور زندہ رکھنا اور جن کاموں کو وہ ناتمام چھوڑ گئے ہیں ان کی تکمیل ہمارا اخلاقی اور قومی فریضہ ہے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب تک ہمارے اذہان غیر ملکی اثرات سے پاک نہیں ہوتے قومیت کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہیں آسکتا اور اس وقت تک ہم علمی اور تخلیقی میدان میں ترقی کا کوئی خواب نہیں دیکھ سکتے - ہمیں اپنے ماضی کے تلخ تجربات سے اپنے مستقبل کو روشن کرنا ہے، اس کا واحد ذریعہ تعلیم ہے، جسے سو فیصدی ہماری مادری زبان میں ہونا چاہئے، اس کا بجٹ بھی معقول ہو - جو سرمایہ انگریزی زبان کے فروغ اور رومن رسم الخط کی اشاعت میں لگایا جا سکتا ہے کیوں نہ اس کو اردو اور بنگلہ زبانوں کی تعلیم پر خرچ کیا جائے جب کہ حکومت اور عوام ان دونوں کو اپنی سرکاری اور قومی زبانیں تسلیم کر چکے ہیں اور دوسری پاکستانی زبانیں بھی اپنی اپنی جگہ پھول پھل رہی ہیں -

ثقافتی اقدار

وہ موتی علم کے یعنی کتابیں اپنے آباء کی
کہ دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
(روح اقبال رح سے معذرت کے ساتھ)

جب کوئی قوم مسند جہاں بانی پر قدم رکھتی ہے تو وہ سب سے پہلے زبان اور ادب کیطرف متوجہ ہوتی ہے چنانچہ صدر مملکت پاکستان کے وہ تازہ اعلانات جنہیں ہم ابھی اپنی سابقہ سطور میں پیش کر چکے ہیں اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ تعلیمی کمیشن کا قیام بھی اسی مقصد کو واضح کرتا ہے۔

فی الحقیقت زبان ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے ان خیالات کو قلم تحریر کرتا ہے، یہ تحریر ہمارا رسم الخط کہلاتی ہے، رسم الخط کے نقوش کو ہم اپنا ادب کہتے ہیں۔ ادب حیات انسانی کی تفسیر ہے، اس تفسیر میں زندگی کے وہ اصول اور ضابطے سامنے آتے ہیں جن کا اطلاق انسان پر ہوتا ہے جنہیں ہم بالفاظ دیگر اپنے مذہب سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان اپنی حیات مستعار میں جو اعمال پیش کرتا ہے وہ آئندہ نسلوں کیلئے

جن سے هشیار قومیں سبق اور تجربه حاصل کرتی هیں ـ
قابل اخلاف اپنے لائق اسلاف کی اعلیٰ روایات پر عمل کر کے
اپنے حال کو مستحکم اور مستقبل کو شاندار بناتے
هیں ـ جو قوم علم سے بیگانه عمل سے عاری اور سیاسی
اعتبار سے مفلوج اور محکوم هوتی هے اسکا ’’ پدرم سلطان
بود ،، کے راگ الاپنے کے سوا زندگی کا کوئی نصب العین نہیں
هوتا ـ یہاں تک که وه اپنے آثار حیات چھوڑے بغیر
صفحهٔ هستی سے غائب هو جاتی هے، اس کے بعد اس کا کوئی نام
لیوا بھی نہیں هوتا ـ الغرض اس طرح قوموں کی زندگیاں
بنتی اور بگڑتی هیں ـ

آپ نے دیکھا که قوموں کے عروج و زوال کا تاریخ
سے ، تاریخ ـ کا مذهب یا اسانیت سے ، انسانیت کا ادب سے،
ادب کا رسم الخط سے اور رسم الخط کا زبان سے کتنا قریبی
رشته هے ـ یه کڑیاں آپس میں اس طرح پیوسته هیں که اگر
ان میں سے ایک کڑی بھی نکل جائے تو سارا نظام ٹوٹ جاتا
هے مقصد یه که ادب اجتماعی زندگی سے بے نیاز نہیں بلکه
اس کا ترجمان هے اور جب ترجمان هے تو اس کو هماری
زندگی پر اثر انداز هونا چاهئیے ـ اثر انداز هونے کے معنی یه
هیں که وه هماری زندگی کے هر شعبه پر تنقید کرے ،
همارے اچھے اور برے اعمال کا نه صرف جائزه لے بلکه
جمالیاتی پرتو سے هماری زندگی میں ایک تعمیری اور
انقلاب برپا کرے ـ

ہم انقلاب کی بجائے لفظ اصلاح بھی لاسکتے تھے کیونکہ اصلاح ترقی کی ضامن ہے ترقی پسندی کا وجود انقلابی اور اصلاحی ہر دو ادب میں موجود ہے، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ انقلابی ادب سماج کے فرسودہ اور تباہ کن رسم و رواج کے خلاف علی الاعلان بغاوت کرتا ہے ان میں اساسی تبدیلیاں پیدا کرکے نظام زندگی کو ایک نئے سانچے اور صحت مند قالب میں ڈھالتا ہے۔ چونکہ اس کے اس باغیانہ طرز عمل سے حال کی بوسیدہ بنیادیں دھسنے بیٹھنے اور گرنے لگتی ہیں اس لئے بادی النظر میں اسے تخریبی سمجھا جاتا ہے حالانکہ جن خطوط پر وہ مستقبل کی شاندار عمارت اور اس کے گرد حصار کھینچنا چاھتا ہے وہ یقیناً تعمیری ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انقلابی ادیب سماج کے تمام طبقوں کی زندگی اور زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے ادب کا موضوع اور مبحث بناتا ہے۔

اس کے برعکس اصلاحی ادب سماج کی تمام کمزوریوں اور خرابیوں کو جو اس کے بنیادی ڈھانچے میں رسم و رواج کے بندھنوں سے جکڑی اور چمٹی ہوئی ہوتی ہیں تبدیل کئے بغیر ان نقائص کو ختم کرنا چاھتا ہے، وہ موجودہ سماج کے مذہبی، تمدنی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی عیوب کو بالواسطہ یا بلاواسطہ محسوس تو کرتا ہے، بعض اوقات بے چین ہوکر دل ہی دل میں کڑھتا بھی ہے لیکن خود اس کا مریض ہونے کے باعث ان پہاڑوں سے ٹکر لینے کی جرأت یا ہمت نہیں کرتا۔

انقلابی اور اصلاحی ادب سے ہٹ کر ایک تیسرا ادب بھی ھے جسکی بنیاد خاص ادب پر ھے یعنی " ادب برائے ادب "۔ اس ادب کے فنکار ادیب غم روزگار سے بے نیاز اور حقیقی سوز سے محروم ہوتے ھیں، وہ اپنے تخئیل میں ھمیشہ رومانی قلعے اور فرضی جنتیں تعمیر کرتے ھیں۔ انھوں نے اپنے شورش تخئیل کا نام حسن رکھا ھے، وہ اضطراب قلب کو عشق اور عشق کی ناکامیوں اور محرومیوں کو زندگی کا ماحصل اور خلاصۂ کائنات جانتے ھیں۔ ان کا نظریہ یہ ھوتا ھے کہ آرٹ فرد کی شخصیت کو نمایاں کرتا ھے، آرٹسٹ حسن کا خلاق ھے۔ اس کی نگاہ میں اجتماعی زندگی کے مقاصد اور خارجی عناصر بے معنی اور لایعنی ھیں۔ وہ اپنی تصانیف میں معشیت، معاشرت اور سیاست کی آمیزش کو اپنی بدذوقی رخنہ اندازی اور غلامی تصور کرتا ھے۔ وہ چاھتا ھے کہ اُسے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اُس کے قول و فعل پر کوئی اُسے ٹوکنے والا نہ ھو۔ ایسے ادب کو زر کی حاکمیت، قومی انتشار، تمدنی انحطاط اور سیاسی بد حالی پروان چڑھاتی ھے۔ اس قسم کے ادب سے قوم کو ایک رسمی اورسطحی اتنا فائدہ ضرور پہنچتا ھے کہ بیگانۂ ادب دماغ اور نوخواندہ افراد وقت گزاری یا تعیش طبع کے لئے معروف اور غیرمعروف شاعروں کا رنگین اور عاشقانہ کلام، ادیبوں کے جاسوسی اور رومانی ناول، افسانے، جن اور پری کی فرضی داستانیں اور غلط سلط مذھبی لٹریچر پڑھتے ھیں اس طرح

عوام میں ملکی زبان آهسته آهسته پھولتی پھلتی رهتی ہے۔ اس بہانے خواندگی کا معیار بھی بڑھتا رهتا ہے۔

ظاهر ہے که یه ادب لغو اور بے معنی تو نہیں هوتا لیکن قطعاً غیر مقصدی هوتا ہے ایسا ادب جسکا کوئی خاص مقصد نه هو اور ادیب جو اس حقیقت سے نا آشنا هو که اسکا ادب قوم اور سماج کے لئے فائده بخش ہے یا ضرر رساں، ایک ایسے راهی کی مانند ہے جس کی کوئی منزل نه هو۔ اُن فنکاروں کا کیا کہنا جو جمالیات کے مقلد هونے کے ساتھ ساتھ ادب کی افادیت اور مقصدیت کو واضح هی نہیں بلکه اپنی قوم کے مزاج اور روح کو بدل کر اُسے عمل کا پیکر بنا دیتے هیں

مدعا یه که ادب کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی، اقتصادی اور سیاسی مقاصد کے ماتحت عمل میں آنی چاهیئے جو قومی اور نسلی تعصب، علاقائی اور طبقاتی کشمکش، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، جاگیرداری کے نظام کہنه، سرمایه کو افراد کی ذاتی ملکیت، پیداوار کی غلط تقسیم مزدور، کشی، عزت و ناموس کی پامالی، سیاسی مسابقت، فاشزم، سوشلزم، کمیونزم اور تمام جدلیاتی لعنتوں کا جانی دشمن اور قاطع هو۔ جو مذهب کا امین، تهذیب و تمدن کا محافظ، امن و عافیت کا علمبردار، مساوات کا حامی، فارغ البالی کا پیش خیمه، علوم و فنون کا نگران، ذهنی و روحانی صلاحیتوں کا خالق، ان تمام نظریات کا ناشر اور ضامن هو، زندگی کی ترجمانی کے تقاضوں کی تخلیق کرے۔

پروفیسر اختر انصاری علیگ ، دور حاضر کے ایک مشہور ترقی پسند ادیب، نے اپنے مطبوعہ مقالے "افادی ادب" میں ادب کے اس موضوع پر نہایت ھی فاضلانہ انداز میں ایک سیر حاصل بحث کی ھے، یہ مضمون لکھتے وقت ھم نے بھی اس سے استفادہ کیا اور اس مقالے کی روح کو اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیا - اھل ذوق چاھیں تو اس کو پڑھ کر پورا پورا لطف اٹھا سکتے ھیں -

ادب پر یہ مختصر سا تبصرہ ثابت کرتا ھے کہ قوموں کی زندگی اور سلطنتوں کی بقا کا دارو مدار زبان اور ادب پر ھے - اسی لئیے شاھان وقت اور حاکمان عصر سب سے پہلے اسکی طرف متوجہ ھوتے ھیں، یہ شعر کتنا برمحل اور کتنی سچی ضرب المثل ھے :

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کس را بدولت می رسانم

شمشیر آبدار اسقدر کارگر نہیں ھوتی جسقدر زبان خارا شگاف، زبان کے تمام جوھر رسم الخط میں پوشیدہ ھیں، اگر ھم پرایا رسم الخط اور غیروں کی زبان اختیار کریں تو ھمارے لئے یہ ایک ایسی تلوار ھوگی جو ھماری روحانی قوتوں اور ذھنی صلاحیتوں کو مفلوج کر دے گی - ھمارا عزم مضمحل، کردار پست اور عمل کا جوش و خروش ختم ھو جائے گا - ھم پھر دوسروں کے محکوم، غلام اور محتاج ھو جائیں گے -

یوں تو ھمارے ادب کی ابتدا حضرت محمد بن قاسم تسخیر ہند (۷۱۱ء) سے ھوتی ھے، ارمغان حجاز

(عربی) وہی ہندوستان میں لائے تھے لیکن فی الاصل ہم
اپنے ادب کے چوتھے دور سے گزر رہے ہیں ۔ پہلا دور
سلطان محمود غزنوی سے امیر تیمور پر ختم ہوتا ہے جب
ہندوستان میں اردو کی داغ بیل پڑی ، دوسرے دور کا
اختتام (۱۸۵۷ء) کے ہنگامۂ آزادی پر ہوا ۔ یہ اردو
زبان اور رسم الخط کی پرورش کا زمانہ تھا ۔ تیسرا پرآشوب
دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا وہ زمانہ ہے جس میں
انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہمارے سابق ہم وطن اردو زبان
اور اس کے رسم الخط کے خلاف درپے آزار رہے ۔ گذشتہ
ڈیڑھ سو برس کے اس عرصۂ چپقلش میں برصغیر ہند و پاک
میں انگریزی حکومت نے ترجمہ و تالیف کا ایک بھی ادارہ
قائم نہیں کیا اور نہ فنکاروں کی کبھی پرسش اور ہمت افزائی
ہوئی ۔ جو کچھ ہوا وہ قوم کی ذاتی اور نجی کوششوں سے
ہوا دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام بھی ایک محکوم ریاست
ہونے کے باعث نیم سرکاری ادارے سے زائد نہ تھا مگر
بہر نوع ایک نعمت غیر مترقبہ تھا جس سے ہم ایک
بڑی حد تک مستفید ہوئے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا ادب
اور ہمارے فنکار دونوں سرمایہ دارانہ نظام اور ہندی
تعصب کا شکار اور مجسم فریاد ہو کر رہ گئے اور اب ہماری
آزادی کے یہ بارہ طویل برس بھی اسی گذارش و التجا
آرزو اور ارمان میں گزر گئے ۔ دو چار آنسو پونچھ
طفل تسلیوں سے بہلایا گیا تو کیا ہوتا ہے نہ
دارالترجمہ ہے اور نہ کوئی اردو یونیورسٹی

اسلامی تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے تو دماغ گنگ اور عقل حیران ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں عربوں کے پاس کیا تھا، صرف زہیر و لبید کی عشقیہ شاعری۔ لیکن جب انھوں نے ادب کی طرف توجہ کی تو صرف ڈیڑھ سو برس کی قلیل مدت میں وہ علوم و فنون کے مالک بن گئے۔ آنحضرت صلعم کی وفات ۶۳۲ء میں ہوئی۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین کا تیس سالہ مختصر دور (۶۳۲ — ۶۶۲ء) اسلامی سیاست کا دور طفولیت تھا مگر ادب کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ ادب و انشاء کا آغاز دراصل عہد بنو امیہ (۶۶۱ — ۷۵۰ء) سے ہوتا ہے جسکا فروغ عہد بنو عباسیہ (۷۵۰ — ۱۰۱۷ء) میں ہوا۔ اس عہد آخر میں زوال بغداد اور اسپین کا اسلامی دور بھی شامل ہے۔ ۸۵۰ سال کی مدت میں اسلام نے جس سر زمین پر قدم رکھا وہیں علوم و فنون کے چشمے پھوٹ نکلے سیکڑوں علماء و فضلاء پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ہزارھا تصانیف پیش کر کے مختلف علوم و فنون کے سمندر بہائے اور تمام دنیا کو سیراب کیا۔ غلام جیلانی برق اپنے ایک مضمون ''ادبائے اردو کی خدمت میں'' مطبوعہ 'نقوش' لاہور میں لکھتے ہیں :

> ''عہد مامون میں بغداد کا یہ عالم تھا کہ عام آبادی تھوڑی تھی اور علماء زیادہ، تالیف و ترجمہ کے بے شمار ادارے قائم تھے، جہاں یونانی، شامی، آرامی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت سے عربی میں تراجم ہوتے تھے۔ صرف بغداد میں ۴۲ لائبریریاں

تھیں جن میں کتب کی مجموعی تعداد تین کروڑ
سے کم نہ تھی، عبدالرحمن نے اسپین میں ایک
کتب خانہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں بقول ڈریپر
۵، ۱ لاکھ کتابیں تھیں - ماموں کی والدہ زبیدہ کے
ذاتی کتب خانہ میں ٦ لاکھ سے بھی زائد کتب
تھیں - . . . . ایک بزرگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں
جنھوں نے قرآن حکیم کی تفسیر بارہ سو جلدوں میں
لکھی تھی،، -

الغرض ماضی بعید کی ان عظیم اور دانشمند شخصیتوں نے اپنے آپ کو علم کیلئے وقف کر دیا تھا - یہ انہیں عالی حوصلہ اور بلند ہمت بزرگوں کا فیض تھا جنھوں نے خیابان عربی کو گوناگوں گلہائے ادب سے معمور کیا، دنیائے اسلام کی شان و شوکت کا سہرا دراصل انہیں کے سر ہے - انہیں کے موئے قلم نے مسلمانوں کے ادب کو چار چاند لگائے - اسی عربی سے فارسی نے فروغ پایا - اردو کو بھی فصاحت اور شیرینی انہیں دونوں زبانوں نے بخشی - ہمارا رسم الخط بھی ان ہی کا تحفہ ہے جسے ہم نے کئی سو برس کی محنت و مشقت کے بعد مرصع اور مہذب بنایا ہے، آج ہم اس قابل ہیں کہ دوسری تعلیم یافتہ قوموں کے رو برو فخر کے ساتھ اپنی زبان اور رسم الخط کو پیش کر سکتے ہیں چہ جائیکہ ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں وقت کی بڑھتی ہوئی نئی ضروریات کے ما تحت البتہ چند فنی اور طباعتی دشواریاں ہماری راہ میں ضرور حائل ہیں لیکن

یہ سب سطحی اور عارضی مشکلات ہیں، ان پر بھی جلد یا بدیر قابو پایا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم صحیح معنوں میں اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور حکومت کا رویہ مربیانہ اور سرپرستانہ ہو۔ رسم الخط کی تبدیلی کی یہ تحریک سراسر غیر اصلاحی اور قطعاً بے جان ہے۔ ہم اردو کو اس طرح تہ تیغ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ مولانا رومی، حافظ، سعدی، فردوسی، خیام، خسرو، سر سید، میر، غالب، شبلی، حالی، آزاد اور اقبال کو جو ہمارے ادب کے مہر و ماہ ہیں ان کے کارناموں کو نہیں بھول سکتے۔

ذرا غور تو کیجئے ہماری صحافت کا کیا حشر ہوگا۔ وہ صحافت جو ہر سماج کا جزو اعظم ہوتی ہے۔ صحافیوں کو سخت سے سخت اور ناساز گار حالات میں بھی عوام کے حقوق و مفادات اور ملک کے دفاع و آزادی کیلئے ہمیشہ پیش پیش رہنا پڑتا ہے۔ قلم صحافت کی آہنی جنبشیں قوم کے ارتقائی رجحانات کی تائید کے ساتھ ساتھ سماج کے فرسودہ عناصر اور تباہ کن رسم و رواج کے خلاف ہمہ وقت قلمی جہاد کرتی ہیں۔ ان کی یہ سنجیدہ اور مخلصانہ عملی سرگرمیاں ملک و قوم کو جمہوری نظام کا ایک حسین تصور ایک خوش نما آئیڈیل پیش کرتی ہیں۔ پاکستان میں اس تصور، اس آئیڈیل کو نیزۂ عربی سے تراشا ہوا اردو قلم، میر و مرزا کی زبان اور اقبال کی 'بانگ' اور 'ضرب' ہی پیش کرسکتی ہے۔

ہمارے ملک کے ۹۹ فیصدی رسائل اور اخبارات اقتصادی اعتبار سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا

ہیں ۔ ان کی حیات محض تجارتی اشتہارات پر موقوف ہے ۔ اگر رسم الخط کی تبدیلی عمل میں آئی تو یہ سب زندہ درگور ہوجائیں گے ۔ مالکان اخبار میں ایسا ۔کون سا قارون اور حاتم صفت مالک اخبار ہے جو اپنے اخبار یا رسالے کو رومن ٹائپ میں چھپوا چھپوا کر اپنے دفتر میں اس کی ٹنوں ردی جمع کرتا رہے گا اور پھر اس انبار کو کوڑیوں کے مول فروخت کرے گا ۔ اس طرح پریس کی آواز اور رائے عامہ کہاں تک باقی رہے گی ؟

آج جب از منۂ قدیم کا ایک ایک آثار، ایک ایک پتھر اور ایک ایک ذرہ کھود کھود کر ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جا رہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ، حرف اور نقطے کو پڑھ کر عہد قدیم کی تاریخ مرتب کی جا رہی ہے ۔ ان نوادرات پر لاکھوں روپیہ صرف کرکے انھیں عجائب خانوں کی زینت بنایا جا رہا ہے، ان کی ہر ممکن حفاظت کی جا رہی ہے، لیکن اردو زبان اور اردو رسم الخط جیسی قدیم اور عزیز یادگار کو فنا اور دریا برد کرنے کی درد ناک تدابیر سوچی جا رہی ہیں ۔

کیا کیا کہوں، کہتے ہوئے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے، وقت کسی کی ملکیت نہیں کار و بار زندگی کے لئے تو قدرت کا نظام شمس و قمر ہی کافی ہے جسے دن اور رات سے تعبیر کرتے ہیں، ان ہی کی بنیاد پر ماہ اور صدیوں کا شمار ہوتا ہے ۔ لیکن شمس و قمر کے طلوع و غروب کے ما تحت اقوام عالم نے ۲۴ گھنٹے

رهبر وقت بنا کر اپنے اپنے ملک کا وقت مقرر کیا، جب هم غلام تھے همارا وقت حاکم عہد کے وقت کا محکوم تھا ۔ هماری جد و جہد آزادی سے جوں هی آزاد پاکستان وجود میں آیا تو شہید ملت نواب لیاقت علی خان نے فرمایا که همارا بھی ایک اسٹینڈرڈ ٹائم هونا چاهیئے ۔ اس مقصد کے لئے وقت کی سوئیاں تبدیل کردی گئیں، مغربی اور مشرقی پاکستان کا ٹائم مقرر هو گیا ۔ ایسا کیوں کیا گیا، کام تو اس کے بغیر بھی چل رها تھا اور چل سکتا تھا لیکن وہ دانائے وقت جانتا تھا که وقت کا غلام هونے سے وقت کا آقا هونا هزار درجے بہتر و افضل هے، واضح رهے که یه قطب نما اور وقت نما (گھڑی) بھی مسلمانوں هی کی ایجاد هے ۔ هارون الرشید نے فرانس کو ایک گھڑی تحفه میں بھیج کر یورپ کو "گرینچ ٹائم" کا مالک بنایا ۔ ارض و سما کے تمام علوم هماری هی تحقیق اور همارے هی بخشے هوئے هیں ۔ یه وقت کی کرشمه سازی نہیں تو اور کیا هے که هم مغرب زدہ هو کر جہاں سے چلے تھے پھر وهیں لوٹنے کی فکر کر رهے هیں ۔ اب آپ هی بتائیے که رجعت پسند کون هے؟

ان تاریخی شواهد کی موجودگی میں همارا اردو زبان اور اردو رسم الخط کا مطالبه جائز هے یا نا جائز، نیا هے یا پرانا ۔ اگر یه کہا جائے که هم ماضی قریب میں آزاد هوئے هیں ابھی همارا دستور مکمل اور نافذ نہیں هوا هے، اس لحاظ سے زبان اور رسم الخط کا مسئله بھی هنوز تازہ اور نیا هے، بحث کی خاطر اگر هم اپنی اس قدیم تحریک کو نئی

تحریک مان لیں اور رسم الخط کو بھی اس میں شامل سمجھ لیں جو اس وقت تعلیمی کمیشن کے رو برو ہے تو کیا ارباب نظر کا یہ انتہائی فریب نظر اور کوتاہ بینی نہ ہوگی کہ وہ ہماری صدہا برس کی کوششوں اور کاوشوں کو یکسر نظر انداز کردیں ۔

اگر ہماری ان سابقہ مساعی کو انگریزی اور امریکی مصلحتوں کی خاطر نظر انداز کیا گیا تو یقین کیجئے کہ ہماری حکومت کا یہ سرکاری اقدام بھی محض وقتی اور ہنگامی ہو کر رہ جائے گا کیونکہ زبان اور رسم الخط عوام کی ملکیت ہے، حکومت تو صرف اس کی محافظ اور امین ہے، یہی وعدہ بھی کیا گیا تھا ۔ اس زبان اور رسم الخط کی خاطر ہم نے بھارت سے اس لئے تو ٹکر نہیں لی تھی کہ آزاد اور خود مختار ہونے کے بعد ہم اپنی اس دولت سے انگریزوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں گے ۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس بھی اسی نظریہ کا شکار ہوا تھا ۔ روس کی نئی تحریک انتہا پسند اشتراکیت نے اپنے ماضی کی تمام روایات کو یکسر اور تمام تر حرف غلط کی طرح فراموش کر دینا چاہا تھا لیکن انجام کار اس کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی اور روش کو بدلنا پڑا ۔

ہمارے ادب میں جو ترقی پسند رجحانات پیدا ہوچکے ہیں اور جو نیا انقلابی اور تعمیری دور شروع ہونے والا ہے اس کی باگ ڈور اور تمام تر ذمہ داری ملک کے موجودہ ادیبوں کے ہاتھوں میں ہے، انھیں وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑے گا

اپنی ذھنیتوں میں حسب ضرورت لچک اور سختی دونوں پیدا کرنی ھوں گی ۔ رجعت پسندی کو بالائے طاق رکھ کر شعر گوئی ، ڈرامہ ، ناول نگاری اور افسانہ نویسی کو محدود اور مختصر کرنا پڑے گا ، ادب کے دھاروں کا رخ علوم و فنون کی سمت پھیرنا ھوگا ۔ ترجمہ ، تالیف اور تصنیف کے ذریعے ان مختلف علوم و فنون کو جو اس وقت ھمارے مدرسوں ، کالجوں اور فنی درسگاھوں میں پڑھائے جاتے ھیں یا زیر غور ھیں اور اب تک اردو میں منتقل نہیں ھوئے ھیں داخل اور شامل کرنا ھوگا تاکہ آنے والی نسلیں اور مستقبل کا مورخ ھمارا نام بھی تعظیم کے ساتھ لے اور ھمیں محبت سے یاد کرے ۔

صوبجاتی اور بین الاقوامی اتحاد

تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھکر ساز فطرت میں نوا کوئی

اقبال رح

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ پاکستان کے بیشتر حصوں کی علاقائی زبانوں ـــ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور فارسی ـــ کا رسم الخط اردو ہے یا اردو سے بالکل ملتا جلتا ہے، اس کے علاوہ چونکہ اردو زبان میں ان تمام زبانوں کے الفاظ بھی شامل اور مستعمل ہیں اس لئے ایک معمولی فہم و قابلیت کا آدمی بھی ان زبانوں کو اردو رسم الخط میں با آسانی پڑھ سکتا ہے۔ ان زبانوں کے برعکس بنگلہ کا رسم الخط دیوناگری ہے اور اس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت ہیں، لہذا بیرون بنگال یہ ناقابل فہم ہے، البتہ قدیم ٹھیٹ بنگلہ کے مقابلے میں اب جو جدید آسان بنگلہ اردو رسم الخط کے روپ میں ہمارے سامنے آ رہی ہے وہ نسبتاً زیادہ آسان اور سمجھ میں آنیوالی ہے۔ اگر اردو و بنگلہ اتحاد کی یہ مبارک تحریک اسی طرح پروان چڑھتی رہی تو اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ جلد یا بدیر ایک وقت ایسا آئے گا

رسم الخط کے سہارے مغربی پاکستان کے عوام عربی، فارسی اور انگریزی کی طرح بنگلہ کو بھی اپنی ایک علمی زبان بنالیں گے اور کیا عجب کہ اس اتحاد کی روشنی میں بنگلہ کا موجودہ دیوناگری رسم الخط دھندلا ہوتے ہوتے بالکل ہی غائب ہوجائے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگلہ گو با اعتبار بولی کثرت آبادی کے باعث پاکستان کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے مگر بلحاظ رسم الخط مغربی پاکستان میں اس کو وہ حیثیت حاصل نہیں جو آ سے مشرق پاکستان میں حاصل ہے، اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان کی علاقائی زبانیں بالخصوص اردو مشرق پاکستان میں زیادہ رائج ہے ۔ رہا انگریزی کا معاملہ تو اس کی نوشت و خواند سے واقف پورے پاکستان میں صرف ۱۴ لاکھ نفوس ہیں ۔ انگریزی کی یہ تعداد اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی اکثریت اس سے متنفر ہے ۔

ماحصل یہ کہ پاکستان جو مختلف زبانوں کا گہوارہ ہے اگر اس کی تمام قومی زبانیں سب سے زیادہ محبوب اردو رسم الخط میں تحریر کی جائیں اور اُن کی تعلیم دی جائے تو اس رسم الخط کی یکسانیت کی وجہ سے تمام زبانیں اپنی جگہ پہلے سے زیادہ پھولیں پھلیں گی اور اس طرح اردو اور بنگلہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے لئے قابل قبول سرکاری زبانیں ہوجائیں گی ۔ اس وقت دونوں زبانوں میں رسم الخط کی وجہ سے غیریت ہے، اُس وقت اتحاد ہوگا جیسا کہ دوسری زبانوں کا حال ہے کہ اُن سے کسی کو کوئی چشمک یا

رقابت نہیں ہے ۔ رومن رسم الخط اختیار کرنے کا تو صاف اور صریح نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان میں مغرب سے مشرق تک پورے ۸ کروڑ عوام کو تمام زبانوں کی تعلیم، رومن رسم الخط میں دینے کی زبردست کھکھیڑ اٹھانی پڑے گی اور تمام زبانوں کے ثقافتی سرمایہ کو رومن رسم الخط میں تبدیل کرنا پڑے گا ۔ اس عمل سے قوم کی دولت اور وقت کا جس قدر نقصان عظیم ہوگا وہ ظاہر ہے ۔

ہر زبان میں خواہ وہ کتنی ہی ناخواندہ اور پس ماندہ طبقے کی ہو کچھ نہ کچھ ادب ضرور ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ہماری تمام علاقائی زبانیں اپنی کچھ روایات رکھتی ہیں ۔ ان کی زبان کے ادب کا تمام تر سرمایہ ان کے رسم الخط میں ہے جسے وہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے، یہی صورت بنگلہ کی ہے، مغربی پاکستان کی بہ نسبت مشرقی پاکستان زیادہ پس ماندہ ہے لیکن اس پس ماندگی کے باوجود وہ اردو (جسے وہ سمجھ سکتا ہے، صرف لکھ نہیں سکتا) کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان ماننے کے لئے تیار نہیں ۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ رومن رسم الخط کو کس طرح پسند کر لے گا ۔

استصواب رائے کے سلسلہ میں جو مراسلات 'جنگ' میں شائع ہوئے تھے ان میں ایک صاحب نے ایک بنگالی بھائی کا یہ قول نقل کیا تھا : "کہ ہم اردو کے بہرصورت مخالف ہیں اور مخالف رہیں گے خواہ وہ اپنے موجودہ رسم الخط میں رہے یا رومن لباس میں سامنے آئے"

اسی طرح ہمارے ایک دوست کے بقول مشرقی پاکستان میں بنگلہ بولنے اور لکھنے والے، دیوناگری رسم الخط کے مقابلے میں عربی نسخ اور اردو نستعلیق کو ایک مقدس یا بھاری پتھر سمجھ کر محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ مشرقی پاکستان کی ''انجمن حروف القرآن،، نے لاکھوں کتابیں عربی رسم الخط میں چھاپ کر اور لاکھوں بنگالی طلبا کو سکھا اور پڑھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان بچوں کو عربی رسم الخط سکھا کر تمام زبانوں کی تعلیم دی جا سکتی ہے - بہرنوع جس طرح اردو کے لئے رومن رسم الخط قابل قبول نہیں ہے اسی طرح ہماری تمام علاقائی زبانوں اور بالخصوص بنگلہ کے لئے بھی قطعاً غیرموزوں ہے پھر بھی اسکا آخری فیصلہ بنگلہ کے ماہران زبان ہی کر سکتے ہیں، البتہ کمیشن کا اپنی جگہ یہ سمجھانا ایک خیال خام ہے کہ رومن رسم الخط اردو اور بنگلہ کی خلیج کو پاٹ سکتا ہے جب کہ دونوں فریق اردو اور بنگلہ کو بادل خواستہ یا ناخواستہ پاکستان کی سرکاری زبانیں پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں -

جہاں تک ہمارے بین الاقوامی اتحاد اور امن کا تعلق ہے ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اول تو تمام ممالک اسلامیہ، مذہبی وحدت اور اسلامی رشتۂ اخوت کی بناء پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں دوم ہمیں جغرافیائی اتصال کی بدولت قربت مکانی بھی حاصل ہے- سوم تمام بلاد اسلامیہ (بجز ان حکومتوں کے جو فرانس یا برطانیہ کے

ابھی تک زیر اثر ھیں) کی مذھبی، علمی اور قومی زبان
عربی، فارسی اور اردو ہے اور رسم الخط قرآنی ہے جو اردو
سے بے انتہا مشابہ ہے اس ربط اور مناسبت کے باعث ھم
ایک دوسرے کی زبان خاصی آسانی سے سمجھ لیتے ھیں اور
ایک دوسرے سے ذھنی قربت بھی محسوس کرتے ھیں
اگر ھم نے اپنی قدیم آبائی زبان اور رسم الخط کو ترک کردیا
تو جس طرح ترکی اسلامی ممالک سے کٹ گیا ھم بھی اُن کے
اجنبی دوست بن جائیں گے۔ اردو زبان سامی زبانوں کے رسم الخط
کو اپنائے ھوئے ہے - رومن رسم الخط اختیار کرنے میں ھمیں
اُن ھی دشواریوں سے دو چار ھونا پڑے گا جن سے گھبرا کر
ایران اور مصر وغیرہ نے رومن رسم الخط کا خیال ترک کردیا
انھوں نے اپنے رسوم الخط میں حک و اضافہ کرکے اپنی
ضروریات کو اس حد تک پورا کیا کہ آج اُن کا اپنا ٹائپ رائٹر
اور ٹیلی پرنٹر دونوں موجود ھیں، ھمیں یہ بھی دیکھنا چاھیئے
کہ ان ممالک کے مقابلے میں ھم جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے
بہت دور ھیں، بدیں وجہ ھمیں رسم الخط کی تبدیلی سے فائدے
کی بجائے نقصان بہت زیادہ ھوگا۔

بلاشبہ ھمیں وقتی سیاست نے اقوام یورپ کا حلیف بنا
دیا ہے، اگر حلیف بن کر امن عالم برقرار رہ سکتا ہے تو ھم
اس اتحاد کو ھمیشہ لبیک کہیں گے لیکن بظاھر یہ
مصنوعی، ھنگامی اور وقتی نظر آتا ہے اور کسی وقت
ختم ھوسکتا ہے، جیسے عراق اپنے حالات اور مفاد کے
پیش نظر معاھدہ بغداد سے علیحدہ ھوگیا

چین اور تبت کے درمیان ہے لیکن چین بھارت سے کشیدہ خاطر ہو رہا ہے ۔

چین اور جاپان نے جن کی زبانیں بہت ھی مشکل اور رسم الخط نہایت پیچیدہ ہے، مغربیت کو تو اپنا لیا لیکن آج تک اپنی زبان نہیں بدلی ۔ یہی حال روس اور فرانس کا ھے بلکہ فرانس پر تو یہ الزام ھے کہ یورپ کے اکثر ممالک اس کی زبان بولتے ھیں لیکن فرانس اپنی فرانسیسی زبان کے سوا کسی دوسری زبان کو منہ نہیں لگاتا ۔ بھارت اس باب میں یورپ کی تقلید کیوں نہیں کرتا، کیا اس کام کے لئے صرف ہم پاکستانی ھی رہ گئے ھیں کہ اپنی زبان کو یورپ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں ۔

مخالف پرو پیگنڈے کے باوجود اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی مقبولیت کا عالم یہ ھے کہ سال گذشتہ جب پاپائے روم نے اپنی معتقد دنیا سے خطاب کرنے کے لئے دنیا کی اول درجے کی زبانوں کا انتخاب کیا تو ان زبانوں میں ایک ''اردو'' بھی تھی۔ اور تو اور روس کی خبر رساں ایجنسی ''تاس'' کی حالیہ اطلاع کے مطابق گذشتہ مارچ ۹۵ء ھی میں افریقی ایشائی سوسائٹی کے زیر اہتمام بیگانہ مذھب روس کے قلب ماسکو میں ایک شاندار تقریب منعقد ھوئی اور اس میں مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ۔ اسی طرح ترکی ایران وغیرہ میں یوم اقبال پر روح اقبال رح کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ھے ۔ یہی نہیں بلکہ یورپ میں مولانا رومی،

سعدی اور خیام وغیرہ کے کلام نہایت آب و تاب کے ساتھ مصور شائع کئے جاتے ہیں، اُن کے تراجم بھی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اس سے قبل خطاطی کے باب میں متعدد ایسے ممالک کو پیش کیا جا چکا ہے جو اپنی علیحدہ قومی زبان اور رسم الخط رکھتے ہیں لیکن السنہ عربی و اردو اور اُن کے رسوم الخط سے بے نیاز اور مستغنی نہیں۔ ان کی جامعات میں ان دونوں زبانوں کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے وہاں عربی اور اردو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں موجود ہیں۔ کیا یہ اردو کا اعجاز، عالم گیر مقبولیت اور اتحاد کا ثبوت نہیں؟

دفتری نظم و نسق اور کاروباری تقاضے

رعنائی میں تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جواء ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
(اقبال رح)

ملک کے نظم و نسق اور کاروبار سلطنت کو چلانے کیلئے مختلف شعبوں اور محکموں کے ماتحت سیکڑوں دفاتر فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہوتے ہیں سرکاری بھی اور نجی بھی جن میں ایک مخصوص نظام کے مطابق شب و روز لاکھوں نفوس کام کرتے ہیں دفاتر کی یہ تنظیم ناگزیر ہے، اگر وقت، کام، محنت اور دولت کی تقسیم صحیح نہ ہو تو دنیا کا سارا کاروبار درہم برہم ہوجائے۔ اس جسمانی اور دماغی محنت و مشقت میں لکھنے پڑھنے کا عمل بھی شامل ہوتا ہے آمدنی اور خرچ کے حساب و کتاب کے علاوہ ہر روز اندرون و بیرون ملک مختلف حکومتوں اور لاکھوں اشخاص کے درمیان خط و کتابت ہوتی ہے۔ اس سرکاری اور نجی مراسلت میں جو زبان اور رسم الخط استعمال ہوتا ہے دراصل وہی اس ملک کی زبان اور رسم الخط کہلاتا ہے۔ اگر کسی ملک کی زبان اور

رسم الخط اتنا عام فہم اور مکاف ہو کہ اسے اپنے ملک کی اکثریت کے علاوہ دوسرے ممالک کے لوگ بھی جانتے ہوں تو ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے آگاہ ہونے کے علاوہ کاروبار میں بڑی آسانی،سہولت اور بچت ہوتی ہے ورنہ عدم واقفیت کی بناء پر ترجمہ کی مشکلات پیش آتی ہیں اس کی وجہ سے کارکردگی، وقت اور دولت کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ ایک عقدۂ لاینحل ہے یہ واقعہ ہے کہ ممالک عالم اور اقوام عالم کی زبان اور رسم الخط نہ کبھی ایک ہوا ہے اور نہ کبھی ایک ہو سکتا ہے، ہم دیکھتے آئے ہیں اور آج بھی یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی ملک کے عوام مختلف زبانیں اور مختلف رسوم الخط استعمال کرتے ہیں پھر بھی کاروبار زندگی اندرون و بیرون ملک بہرنوع برابر جاری رہتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان بحیثیت مجموعی ایک زرعی ملک تھا، بااعتبار صنعت و حرفت دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں اس کا معیار پست تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ریڈکلف ایوارڈ کی عنایت سے صنعتی علاقے ہندوستان کو مل گئے اور پاکستان کورا ایک زرعی خطہ رہ گیا۔ چار فیصدی صنعتی کارخانے پاکستان کے حصے میں آئے یہ پاکستان کی خوش‌نصیبی تھی کہ اس کی زرعی زمین میں خوردنی اور تجارتی فصلیں ملک کی ضرورت سے زائد تھیں۔

ذرائع نقل و حمل میں بھی تقسیم ہندوستان نے پاکستان کو ٹوٹنے میں رکھا۔ تقسیم سے قبل دوسری جنگ عظیم کی بدولت اور تقسیم کے فوراً بعد مہاجرین کی بے پناہ آمد و رفت کے باعث پاکستانی ریلوں اور سڑکوں پر بے تحاشا بار پڑا جس سے ان کی حالت خراب اور تباہ ہوگئی پاکستان کے حصے میں بندرگاہیں بھی صرف دو آئیں ایک کراچی اور دوسری چاٹگام۔

جہاں تک ہماری تجارت کا تعلق ہے وہ بھی تقسیم ہندوستان سے قبل زیادہ تر غیرمسلموں کے ہاتھ میں تھی۔ تقسیم کے بعد یہ تمام تاجر اور سرمایہ دار اپنی دولت سمیٹ کر ہندوستان چلے گئے اس طرح پاکستان کی تجارت، بنکاری وغیرہ پورے معاشی نظام کو زبردست صدمہ پنہچا۔

یہ تھا وہ پس منظر اور ناخوشگوار ماحول جس میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس انقلاب نے جس زبوں حالی سے ہمیں دو چار کیا تھا اس کو دیکھ کر پاکستان کے مخالفین ہنس ہنس کر ہم پر طنز کیا کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ پاکستان ایک شاعر کا خواب اور شیخ چلی کا ایک منصوبہ ہے لیکن اسلام جوہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا ہے اس نے اس مرتبہ بھی حیات نو پائی اور اپنے زندہ ہونے اور زندہ رہنے کا ثبوت پیش کرکے رقیبوں کو قائل اور حیرت زدہ کردیا۔ ہم نے اپنے رقیبوں کو اپنی زندگی کا ثبوت تو پیش کردیا لیکن اس جد و جہد زندگی میں کچھ حقائق بھی شامل ہیں قدرت نے ہمیں جو بے شمار اور بے پناہ قوتیں بخشی تھیں اول اول تو ہم نے ان

سے فائدہ اٹھایا لیکن تھوڑی ہی مدت بعد ہمارے حاکمان وقت
اور ان کی دیکھا دیکھی دولت کے غلام، حریص عوام
دولت و اقتدار کی پرستش کرنے لگے، ہماری مفلسی اور
بد حالی پھر عود کر آئی - نوبت بایں جا رسید کہ ہم خوراک
کے مسئلہ میں بھی غیروں کے محتاج ہوگئے - ہمارا دستور
سلطنت کھٹائی میں پڑا رہا، عوام چیختے چلاتے اور روتے
پیٹتے رہے - آخر کامل دس سال بعد مارچ ۱۹۵۷ء میں
اسلامی دستور و قانون کے نام پر ایک نامکمل اور ناقص
دستور غیر زبان اور غیر تحریر میں پاس ہوا. جس میں سرکاری
زبان کے متعلق حکومت کا یہ فیصلہ سامنے آیا :-

(۱) "پاکستان کی سرکاری زبانیں 'اردو، اور 'بنگالی، ہوں گی - مگر شرط یہ ہے کہ یوم دستور سے بیس سال تک انگریزی زبان کا استعمال ان تمام سرکاری اغراض کے لئے جاری رہے گا جن کے لئے وہ یوم دستور سے عین قبل تک پاکستان میں استعمال کی جاتی تھیں - لیکن مذکورہ بیس سال کی مدت ختم ہو جانے کے بعد پارلیمنٹ مجاز ہوگی کہ بذریعہ قانون ان اغراض کے لئے جن کی صراحت قانون مذکور میں کر دی گئی ہے انگریزی استعمال سے متعلق احکام وضع کرے -

(۲) یوم دستور سے بیس سال گذر جانے کے بعد صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا جو انگریزی کی جگہ دوسری زبان اختیار کرنے کی بابت سفارشات پیش کرے گا -

(۳) دفعہ ھذا میں مذکور، کوئی حکم، کسی صوبائی حکومت کو، اس امر سے باز نہ رکھ سکے گا کہ وہ مذکورہ بیس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے، انگریزی زبان کی جگہ کوئی دوسری زبان صوبے میں استعمال کے لئے اختیار کرے"

دستور کے الفاظ میں رسم الخط کا کوئی ذکر نہیں ہے، ظاہر ہے کہ بیس سال کی مدت ختم ہونے سے قبل بجز مرکزی حکومت کے ہر صوبائی حکومت اس امر کی کاہتاً مجاز ہے کہ کسی بھی زبان کو اپنے صوبے کی سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کرے اور اس زبان کی ادائیگی کے لئے آسے جو رسم الخط پسند ہو وہ استعمال کرے۔ لیکن مارشل لاء کے نفاذ نے چونکہ سابقہ دستور کو سردست کالعدم کر دیا ہے لہذا اس وقت آن اختیارات کو زیر بحث لانا خارج از بحث ہے۔ موجودہ گورنمنٹ زبان کے مسئلہ پر رسم الخط کی روشنی میں غور کرنا چاہتی ہے۔ اگر فی الحقیقت غور و فکر مطلوب ہے جو سابقہ حکومتوں کا فرض تھا، تو یقیناً یہ ہماری دور اندیشی اور فکر صحیح کی دلیل ہے اور اگر یہ سوچ بچار محض رسمی اور ظاہری ہے اور در پردہ یہ طے ہو چکا ہے کہ انگریزی زبان کا جو جواء بیس سال کے لئے ہماری گردنوں پر رکھا جانا تجویز ہوا تھا وہی ہمیشہ کے لئے ہم پر مسلط رہے گا تو بلاشبہ یہ فیصلہ غیردانشمندانہ اور ناپائیدار ہوگا۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور

کریں اور کسی نتیجہ پر پہنچنے سے قبل دوسرے ممالک کے فیصلوں پر بھی ایک نگاہ ڈالیں بالخصوص اُن ملکوں کے جو ماضی قریب میں ہماری طرح آزاد ہوئے ہیں، مثلاً انڈونیشیا اور ملایا ۔

'انڈونیشیا' ۱۹۴۷ء میں ہمارے ساتھ ہی ساتھ آزاد اور خود مختار ہوا ہے، اسی طرح 'ملایا' کو صرف دو سال قبل ۱۹۵۷ء میں آزادی ملی ہے۔ یہ دونوں ممالک مسلمان ہیں ۔ اول انڈونیشیا کے دستور پر نظر ڈالئے ۔ انڈونیشیا کے سفارت خانہ، کراچی نے حال ہی میں جو "تاریخ تمدن انڈونیشیا"، شائع کی ہے اُس پر رسالہ "اردو" کے فاضل مدیر نے اپنے شمارہ بابت جولائی ۔ اکتوبر، ۵۸ء میں ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔ اس تبصرہ میں انڈونیشیا کی سرکاری زبان کا جو مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی رو سے ہمارے ملک میں جو زبانیں قابل لحاظ اور شمار ہیں اُن کی تعداد صرف نو ہے ۔ اس کے برعکس انڈونیشیا میں اس وقت (۲۰۰) زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں، جاوائی، سنڈائی، مدورائی، مننگ کباؤئی، آچپائی، بوگینی، بالینی، ملائی، پنجوسامینی اور ٹوروجائی زیادہ مستعمل ہیں۔ حسن اتفاق سے ان کی تعداد ہمارے ملک کی زبانوں سے صرف ایک زائد ہے اسی طرح انڈونیشیا کی آبادی کم و بیش پاکستان کے برابر ہے ۔ انڈونیشیا کی ان زبانوں کا ماخذ و مخرج لسانی حیثیت سے ملائی

سماترا اور جزیرۂ نما 'ملایا' میں ۱۵۲۰ء سے عربی رسم الخط میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں ۔ 'جاوائی' زبان اگرچہ سوا سات کروڑ نفوس میں سے چار یا پانچ کروڑ عوام کی زبان ہے مگر اپنے قدیم سنسکرت اور کادی رسم الخط کے باعث بجز جاوا کے دیگر جزائر میں نہ تو عمومیت کے ساتھ بولی جاتی ہے اور نہ سمجھی جاتی ہے ۔

یہی صورت بنگلہ اور اردو کی ہے ۔ بنگلہ کا رسم خط دیوناگری ہے اور سوائے مشرقی بنگال کے کہ اس کی آبادی پاکستان کی آبادی کے نصف سے قدرے زائد ہے، بیرون بنگال نا قابل فہم ہے، گویا ہر اعتبار سے انڈونیشیا اور پاکستان کی زبان کا مسئلہ قریب قریب ملتا جلتا ہے ۔

اب ذرا انڈونیشیا کی دور بینی اور قوت فیصلہ دیکھئے کہ انھوں نے جاوائی اور دیگر تمام زبانوں کو چھوڑ کر سماترا کی ملائی زبان کو بلا شرط استعمال انگریزی، اپنے ملک کی سرکاری زبان بنا لیا ۔ ان کا یہ انتخاب بالکل درست اور صحیح ہے، وہ یوں کہ (جس طرح بنگلہ کے مقابلے میں اردو) ملائی زبان سیکڑوں سال سے پورے ملک میں تجارتی طور پر رائج ہونے کی وجہ سے ہر بندرگاہ، ہر جزیرہ اور ہر شہر میں بولی اور لکھی جاتی ہے، اس کے علاوہ اپنے پاس مذہبی اور تمدن کی دولت بھی رکھتی ہے ۔

اب 'ملایا' کا فیصلہ ملاحظہ ہو اسکی آبادی بھی کم و [illegible]کستان کے برابر ہے ۔ وہاں بھی قریب وہی زبانیں جو انڈونیشیا میں ہیں ۔ لہذا ملایا نے بھی انڈونیشیا

کی طرح 'ملائی' کو اپنی سرکاری زبان منتخب کیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ دس سال تک سرکاری مراسلت میں انگریزی کا استعمال جاری رہے گا۔ ہر چند کہ ملایا کا یہ فیصلہ انڈونیشیا کے مقابلے میں قدرے محدود ہے تاہم وہ ہمارے پاکستان سے (سابقہ دستور کے مطابق) دس سال پہلے انگریزی شکنجے سے آزاد ہو جائیگا اور شاید ہم کبھی بھی نہ ہوں۔

غور کیجئے! کہاں پاکستان اور کہاں انڈونیشیا اور ملایا؟ کیا ان دونوں ممالک کے روبرو ہماری طرح سیاسی، سماجی، تجارتی، معاشی اور دیگر بین الاقوامی مسائل نہیں ہیں۔ ان دونوں ملکوں نے ہماری طرح ضرورت سند اور قابل امداد ہوتے ہوئے انگریزی کے سامنے سجدہ کیوں نہیں کیا۔

انڈونیشیا جیسا چھوٹے چھوٹے سیکڑوں جزیرے رکھنے والا ملک جہاں دو چار، دس بیس، بھی نہیں اکٹھی ۲۵۰ زبانیں بولی جاتی ہوں اور ایک جزیرے کا باشندہ دوسرے جزیرے کی زبان نہ سمجھتا ہو، اگر رومن رسم الخط اختیار کر لیتا یا مجبوراً کر لے تو یہ کوئی تعجب اور حیرانی کی بات نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی حکومت بیک وقت ۲۵۰ زبانوں اور رسوم خط کی نگہداشت نہیں کر سکتی۔ ایسے حالات میں رومن رسم الخط کمزور زبانوں کو ختم کر کے یقیناً ایک قومی و سرکاری زبان پیش کرنے کی اصلاحی خدمت انجام دے سکتا ہے، بہر نوع انڈونیشیا اور ملایا کا یہ اقدام قابل تعریف اور لائق تقلید ہے۔

سوائے انڈونیشیا کے کہ جو مشرقی پاکستان سے قریب ہے افغانستان، ایران، ترکی، عراق، فلسطین، حجاز، مصر

سوڈان، مراقش، تمام ممالک اسلامیہ ایک ھی خطے میں واقع ھیں اور یہ سب باھمدگر مذھبی وحدت، جغرافیائی اتصال اور قومی و ثقافتی روایات میں پاکستان سے ھم رشتہ ھیں، بجز ترکی کے کوئی ملک ایسا نہیں جس نے انگریزی کی خاطر اپنی زبان یا رسم الخط کو قربان کردیا ھو۔ پھر یہ احساس کمتری اور کشکول گدائی ھمارے ھی لئے کیوں مخصوص اور مقدر ھو۔ ھماری زبان اور رسم الخط اتنا گیا گزرا تو نہیں کہ بیرون پاکستان اسے کوئی جاننے اور سمجھنے والا نہ ھو۔ اب تو روس جیسے ملک میں بھی مشرقی زبانوں کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ھوگیا ھے وھاں لوگ اردو، ھندی کی تعلیم حاصل کر رھے ھیں۔

اپنے گھر کو دیکھئے۔ پاکستان کی صنعت و حرفت اور تجارت زیادہ تر، بمبئی، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے لوگوں کے ھاتھ میں ھے۔ اگر یہ لوگ قائداعظم کی آواز پر لبیک نہ کہتے اور اپنا سرمایہ پاکستان میں نہ لگاتے تو یہ ساری دولت ھندوستان ھی کے پاس رھتی۔ ان تاجروں میں گو کثرت سے انگریزی خواندہ نہیں ھیں لیکن اس کے باوجود تجارت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ پاکستان کی تجارتی ساکھ اور مالیات کا بھرم دراصل انھیں تاجروں کے دم خم سے قائم اور اونچا ھے ان میں سے بیشتر اپنا حساب و کتاب مارواڑی، گجراتی، سندھی اور ھندی میں رکھتے ھیں اسی کے عادی ھیں اور ھمیشہ اسی میں رکھیں گے۔ دوسرے صوبوں کے تاجروں کی بھی اکثر یت اپنے بہی کھاتے اردو میں رکھتی ھے اور انگریزی

کو زیادہ پسند نہیں کرتی ۔ تجارتی مراسلت انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کرتی ہے ۔ پاکستانی شہروں میں پھرئیے تو آپ کو دوکانوں پر آویزاں بورڈ اب انگریزی کی جگہ کثرت سے اردو میں نظر آئیں گے یا انگریزی کے ساتھ اردو بھی شامل ہوگی ۔

علم معاشیات کی رو سے سکۂ جاریہ کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اس شے میں ہو جس کو بطور زر استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اسکو قبول کرنے میں کسی شخص کو انکار کی جراٴت نہو ۔ دوم یہ کہ وہ اپنی جسامت، شکل، رنگ اور عبارت (جو اس کی قیمت اور حکومت کا نام پیش کرتی ہے) کے لحاظ سے باآسانی شناخت کیا جاسکے تاکہ قبول کرنے والا کوئی دھوکا نہ کھائے ۔ موجودہ نوٹ اور مختلف دھاتوں کے سکے اپنی جگہ خاصے معقول اور دیدہ زیب ہیں ۔ مختصر سی جگہ میں انگریزی کے ساتھ اردو اور بنگلہ میں حکومت کا نام اور قیمت وغیرہ درج ہے اب اگر رومن رسم الخط اختیار کیا گیا تو انگریزی کی جگہ تو وہی سابقہ انگریزی عبارت رہے گی اور دوسری زبانوں میں اردو اور بنگلہ کو رومن رسم الخط میں لایا جائے گا تو کیا یہ صورت مضحکہ خیز نہ ہوگی؟ ۔ اسی طرح ہمارے تولنے کے اوزان، پیمائشی پیمانے، ڈاک، ریل اور بسوں کے ٹکٹ عدالتی اسٹامپ اور بنکوں کے چک وغیرہ کی صورت مسخ نہ ہوجائیں گی ۔

سرکاری دفاتر کا ایک اہم شعبہ ہماری عدالتیں ہیں جہاں مقررہ قانون کے مطابق ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے ۔ اس قانون کا سر چشمہ بھی کلام الہی ہے، جس کی بنیاد پر ہمارا مذہب اسلام قائم ہے ۔ ظاہر ہے کہ مذہب کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ فقہ اسلامی کی مستند کتب ' ہدایہ، اور فتاویٰ عالمگیری، وغیرہ ہیں ۔ ہندوؤں میں " ارتھ شاستر " کو سند مانا جاتا ہے ۔ انگریزوں نے اپنا جو ضابطہ دیوانی انگریزی میں مرتب کیا تھا وہ انہیں کتب کی روشنی میں کیا گیا تھا لیکن جب یہ نافذ ہوا تو تجربے نے انہیں یہ بتایا کہ تنہا انگریزی زبان ہندوستانیوں کو قانون نہیں سمجھا سکتی ۔ مجبوراً انہیں اسے اردو میں بھی منتقل کرنا پڑا ۔ حکومت کے ایما پر ترجمہ کا یہ کام شمس العلما مولوی نذیر احمد دہلوی مرحوم کے سپرد ہوا ۔ انہوں نے تعزیرات ہند، ضابطہ فوجداری، قانون شہادت اور انکم ٹیکس کا با محاورہ سلیس اردو میں ترجمہ کیا ۔ ان کے یہ تراجم آج بھی موجود ہیں، جن سے تمام جج، وکلاء اور طلبا یکساں مستفید ہوتے ہیں ۔ اگرچہ لاء کالجوں میں ابھی تک ذریعہ تعلیم انگریزی ہے لیکن پولیس کے ٹریننگ اسکولوں میں جو عملہ پولیس تھانوں اور کچہریوں میں تعینات ہونے کے لئے قانونی تعلیم پاتا ہے ان کو ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی زبان، اردو ہی میں تعلیم دی جاتی ہے ۔ عوام کے مطالبہ پر اکثر

یا نچلی عدالتوں میں بھی اب اردو کا رواج ہوگیا ہے گو فیصلے اب بھی انگریزی ہی میں لکھے اور سنائے جاتے ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس کے ٹریننگ اسکولوں میں تو قانون کی تعلیم کے لئے اردو کو بہتر ذریعہ تعلیم سمجھا جاتا ہے لیکن لاء کالجوں میں اس کی صلاحیت سے دشمنی برتی جاتی ہے ۔ بہر صورت اردو نے تو اس قانونی باب میں بھی اپنی قانونی صلاحیت کا ثبوت پیش کردیا ہے ، نیز یہاں ایک بار پھر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ زبان اور رسم الخط اپنا ایک مذہب رکھتے ہیں ۔

یہ بھی واضح رہے کہ قانونی کتب انگریزی زبان میں ہونے کے باوجود اپنے مضامین کی کثرت ، طوالت ، ضخامت ، وزن اور قیمت میں کافی مشہور ہیں ۔ اگر اس بحر ذخار کو پولیس کے میٹرک اور نان میٹرک طلبا کے لئے رومن رسم الخط میں منتقل کیا گیا تو پھر یہ بالکل ناقابل عبور ہوجائے گا ۔ مقدمات کی مثلیں ، فیصلے اور اُن کی نقول پہلے سے بھی زائد اوراق پر قلمبند ہوں گی ۔

ان براہین اور نظائر کی موجودگی میں یہ تصور کرنا اور یہ باور کرانا کہ سرکاری اور نجی دفتری کاروبار میں رومن رسم الخط کی وجہ سے ہم آہنگی ، توازن اور سہولت پیدا ہوجائے گی یا انگریزی کے زور اور شدت میں کمی آجائے گی ایک دور از کار بات ہے ۔

نشر و اشاعت

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
اقبال رحہ

اس متمدن اور ترقی یافتہ دور میں وقت کی قیمت اور قدر و منزلت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بلا پس و پیش اور بغیر اندیشہ و بیم انسان کا ہر قدم وقت کی رفتار کے ساتھ اٹھتا ہے، ساری دنیا وقت کے همراہ بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ دوڑ رہی ہے ۔ اس ارتقا کا محرک وہ علم سائینس ہے جس نے قدرت کے پیدا کردہ تمام مادوں، ذرائع اور وسائل کو انسان کی ملکیت اور حاکمیت میں دے دیا ہے ۔ سائینس کی بدولت اس عالم ایجادات میں ایسی محیر العقول چیزیں وجود میں آچکی ہیں، اور آ رہی ہیں کہ اب فلسفۂ حیات و ممات کسی تشریح کا محتاج نہیں رہا :

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اخلاقی اعتبار سے انسان کی زندگی پر سائینس اپنا پرتو کس طرح ڈالتا ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ عیب و صواب اس وقت ہمارا موضوع مبحث نہیں، البتہ

اقتصادی اور معاشی نقطۂ نظر سے سائینس کے نتائج کا تعمیری اور نتیجہ خیز ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔ دیگر ترقیات سے قطع نظر سائیئنس نے اپنی کرشمہ گری سے دنیا کی زبانوں اور اُن کے علوم و فنونہ کی نشر و اشاعت میں معقول حصہ لیا ہے۔ ابتدا میں خط و رقم کے وسائل کیا تھے، اُن تحریروں اور کتبات کے تحفظ اور نشر و اشاعت کا ذریعہ کیا تھا اور آج اُن کا انداز اور معیار کیا ہے؟ آج قدیم تحریری طوالت ''شارٹ ہینڈ،، کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے، قلم کے نقوش ٹائپ رائٹر کے حسن اور رفتار کے سامنے بالکل ماند ہیں۔ کاٹھ کے قدیم دقیانوسی پریس اس زمانہ کی جدید روٹری مشینوں کے مقابلے میں بالکل بیکار اور حقیر نظر آتے ہیں۔

طباعت کا کام دو طرح سے ہوتا ہے۔ اول ''لیتھو،، دوم ''لیٹر پریس،،۔ لیتھو میں پتھر یا زنک پلیٹ استعمال ہوتی ہے اور لیٹر پریس میں ''سکے'' کے ٹائپ یا ''اسٹریو،، سے کام لیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جہاں تک تصاویر وغیرہ کا تعلق ہے وہ لیتھو میں ''ونڈائک،، یا دوسرے طریقوں سے پلیٹ پر اتار کر چھاپی جاتی ہیں اور لیٹر پریس میں بلاک سے کام لیا جاتا ہے۔

مروجہ لیتھو کی طباعت کا آغاز زرد رنگے ہوئے کاغذ پر ایک خاص روشنائی کے ذریعہ کتابت سے ہوتا ہے۔ یہ روشنائی کچی ہوتی ہے، اس لئے کتابت کی غلطیاں آسانی سے درست ہوجاتی ہیں۔ کتابت کے بعد کاپی کو پتھر یا زنک پلیٹ پر جما کر دستی پریس کی مدد سے پہلے پروف اٹھایا جاتا

ہے تاکہ کتابت یا پروف میں جو غلطیاں یا نقائص نظر آئیں انھیں طباعت سے قبل پتھر یا پلیٹ ھی پر درست کردیا جائے، بعد ازاں پتھر کو یونہی مشین پر جما دیا جاتا ہے اور اگر پلیٹ ہے تو اسے سلنڈر پر کس دیتے ھیں ۔ اس پتھر یا پلیٹ پر کیمیائی سیاھی کے رولر دوڑتے ھیں، ان رولروں اور پتھر یا پلیٹ کے درمیان کاغذ دباؤ میں آکر حروف کے نقوش حاصل کر لیتا ہے، پھر یکے بعد دیگرے یہ کاغذ چھپ چھپ کر ایک پرزے کے ذریعہ مشین کی دوسری طرف یا تو خود بخود جمع ہوتے جاتے ھیں یا ایک آدمی انھیں اٹھا اٹھا کر باقاعدہ رکھتا جاتا ہے ۔ تصاویر کی طباعت کے لئے لائن بلاک کے چربوں سے کاپی تیار کی جاتی ہے ۔

لیتھو کی یہی طباعت یورپ اور امریکہ میں نئے انداز سے ھوتی ہے ۔ مثلاً امریکہ نے پلیٹ پر کاپی کا عکس اتارنے کے لئے ونڈائک کا طریقہ ایجاد کیا ہے ۔ اس کی کتابت باریک کاغذ پر سیاہ روشنائی سے ھوتی ہے ۔ انگلستان میں اس کام کے لئے لیتھو آفسٹ ہے جس میں تحریر ھو یا تصویر وہ ھو بہو کاغذ پر چھپ جاتی ہے ۔ کاپی پر تحریر یا تصویر کا رنگ جس قدر شوخ اور چمک دار ھوگا ۔ اسی قدر چھپائی میں اس کا روپ آئے گا ۔ یہ آفسٹ مشین بیک وقت دو تین رنگ بھی چھاپ سکتی ہے ۔ آفسٹ سسٹم میں کاپی کی تحریر ھر داب میں اول ربر کی ایک چادر پر منتقل ھوتی ہے ۔ اس چادر کے الٹے حروف کاغذ پر چھپتے وقت سیدھے ھوجاتے ھیں ۔ اس سے الٹی کتابت کی ضرورت نہیں ھوتی ۔ الغرض باریک اور

رنگین کام کے لئے یہ آفسٹ مشین نہایت ھی مفید اور کار آمد ھے مگر یہ مشین اور اس کے کارکن دونوں بڑی قیمت پر حاصل ھوتے ھیں۔

لیٹر پریس کی طباعت لیتھو کی چھپائی سے بالکل مختلف ھوتی ھے۔ اس کی چھپائی کی ابتدا ٹائپ کمپوزنگ (حرف پردازی) سے ھوتی ھے جو چھوٹے اور بڑے، باریک اور موٹے اور مختلف وضع و قطع کے ھوتے ھیں اور یہ سب فاؤنڈری میں ڈھلتے ھیں۔ کمپوزیٹر (حرف پرداز) ان حروف کو لکڑی کے خانوں میں سے نکال نکال کر اول اپنی ''اسٹک'' میں بھرتا ھے پھر ان اسٹکوں سے صفحہ، کتاب، اخبار یا رسالہ کے سائز کے مطابق ''گیلی'' تیار ھو کر پروف ریڈر کے پاس پہنچ جاتی ھے وہ اس گیلی کی اغلاط درست کرنے کے بعد مشین مین کے حوالہ کر دیتا ھے۔ مشین مین اسے ''چیسس یا لاک اپ'' میں کس کر فرمہ کی شکل میں چھپائی کے لئے مشین پر چڑھا دیتا ھے۔

کمپوزنگ کے جدید ترین طریقوں میں ''لائنو ٹائپ، مانو ٹائپ اور انٹر ٹائپ'' کی برق رفتار مشینیں ایجاد ھوئی ھیں جو فی الحقیقت نہایت کار آمد اور مفید ھوتی ھیں، ادھر آپ نے کچھ فرمایا، ادھر اسٹینو گرافر نے اسے شارٹ ھینڈ میں لکھ کر ٹائپ کیا اور چھپنے کیلئے ''آپریٹر'' کے پاس پریس میں بھیج دیا۔ آپریٹر کے سامنے ٹائپ رائٹر کی قسم کی ایک مشین ھوتی ھے جس کا ''کی بورڈ'' ٹائپ رائٹر ھی کی طرح کا ھوتا ھے۔ ان دونوں کی بورڈوں میں فرق صرف اتنا ھے کہ معمولی ٹائپ رائٹر میں بورڈ کے مطلوبہ حروف انگلیاں مارنے

سے اٹھ جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ربن کو لیتے ہوئے کاغذ پر آن حروف کو چھاپ دیتے ہیں ۔ کمپوزنگ کی مشینوں میں بھی بورڈ پر انگلیاں مارنے سے حروف خود بخود حرکت میں آتے ہیں ۔ ایک طرف انگیٹھی میں سکہ پگھلتا رہتا ہے، دوسری طرف سے یہ حروف اپنی میگزین سے نکل کر سیال سکے میں ڈھلتے جاتے ہیں ۔ اس طرح لائنو اور انٹر ٹائپ میں یکے بعد دیگرے پوری سطر ایک ساتھ ڈھلتی رہتی ہے، اگر ٹائپ کرتے وقت ایک حرف بھی غلط ہو جائے تو پوری سطر از سر نو ڈھالی جاتی ہے ۔ اس کے برعکس مانو ٹائپ میں ہر حرف الگ الگ ڈھل کر گرتا ہے ۔ الغرض یہ سطریں اس طرح ڈھلتی رہتی ہیں، ایک دوسرا پرزہ ان سطور کی گیلی بناتا جاتا ہے ۔ اس گیلی سے مطلوبہ سائز کا صفحہ مرتب ہوتا ہے ۔ پورا فرمہ تیار ہونے کے بعد اگر "فلیٹ بیڈ روٹری" ہے تو اس میں رکھ دیا جاتا ہے اور بجلی کی سرعت کے ساتھ چھپائی شروع ہو جاتی ہے، اخباری کاغذ کی ایک چکی ہوتی ہے جو مشین پر چڑھی رہتی ہے، اس چکی کا کاغذ مشین کے اندر ہی اندر چھپتا، کٹتا اور طے ہو کر باہر نکلتا رہتا ہے ۔ اگر "سلنڈر روٹری" ہے تو چھاپنے سے پہلے دو تین کام اور انجام دینے پڑتے ہیں اور وہ یہ کہ اول پورے فرمے پر ایک موٹا کارڈ بورڈ قسم کا کاغذ رکھ کر اسے دبایا جاتا ہے ۔ اس داب سے تحریر یا تصویر کا ایک کافی گہرا نقش کارڈ بورڈ پر آجاتا ہے ۔ اس کاغذ کو ایک سلنڈر پر چڑھا کر اس کا اسٹریو لیتے ہیں ۔ یوں سمجھئے کہ سکہ کا ڈھلا ہوا پورا فرمہ ایک

مدور شکل اختیار کر لیتا ہے جو چھاپنے کے لئیے روٹری سلنڈر پر جڑ دیا جاتا ہے بعد ازاں حسب قاعدہ مذکور چھپائی مکمل ہوجاتی ہے ۔

فن طباعت اسقدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ یہ مختصرسا مقالہ اور اس کا یہ ضمنی عنوان اس سے زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں ہوسکتا ۔ اگر مزید شرح بھی کی جائے تو جب تک ذاتی مشاہدہ اور عملی تجربہ نہ ہو طباعت کا کام سمجھ میں آنا محال ہے ۔ چونکہ اس فن سے ہم خود برائے نام آشنا ہیں لہذا ہم نے بھی انجمن ترقی اردو پاکستان کی شائع کردہ کتاب " فن صحافت " مصنفه چودھری رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۰۳ء سے قدیم و جدید فن طباعت کا یہ مختصر سا خاکہ بصورت اقتباس پیش کیا ہے تا کہ ہم اپنے مبحث پر کچھ روشنی ڈال سکیں ۔

مدعا یہ ہے کہ دنیا فن طباعت میں ترقی کرتے کرتے آج کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے لیکن اردو نستعلیق کے گلے میں لیتھو کا جو پھندا اول روز طباعت پڑا تھا وہ جوں کا توں موجود ہے بمشکل تمام ایک مدت دراز کے بعد ترقی کی جانب صرف ایک قدم یہ اٹھا ہے کہ وزنی پتھروں کی جگہ ہلکی پھلکی زنک پلیٹوں نے لے لی ہے اور عام لیتھو مشینوں کی بجائے نام نہاد لیتھو روٹری میں چھپائی ہونے لگی ہے جس کے نتیجہ میں چھپائی نسبتاً تیز اور کاپیاں پہلے سے زیادہ تعداد میں حاصل ہوتی ہیں ۔ یہی صورت ... لیٹر پریس کی چھپائی کی ہے جس کی دیر طلب اور تکلیف دہ کمپوزنگ کو ہم ایک مدت سے بھگتتے چلے آرہے ہیں ...

فی زمانہ معیاری کتابیں ، بالخصوص وہ اخبارات اور رسائل زیادہ پسندیدہ اور مقبول ہوتے ہیں جو مصور ہوں ۔ جدید مذاق کا تقاضا یہ ہے کہ متعلقہ تصاویر ، مضامین یا خبروں کے ساتھ ہی شائع ہوں لیتھو میں ایسا ہونا نا ممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہے ۔ اس مقصد کے لئے لائن بلاک کے چربوں سے کام لیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ عمل محض آنسو پونچھنے کے مترادف ہے کیونکہ کثیر اشاعت ہونے کی صورت میں یہ کوشش بھی بےسود ثابت ہوتی ہے ۔ مجبوراً تصاویر کو حسب ضرورت لائن یا ہاف ٹون بلاکس میں علیحدہ علیحدہ چھاپنا پڑتا ہے ۔ لیٹر پریس میں دشواری پیش نہیں آتی ۔

لہذا اب اگر ہمیں اپنی زبان و رسم الخط کا فروغ مقصود ہے اور اپنے ادب کو مختلف علوم و فنون سے مالا مال کرنا ہے تو نہ صرف خط نستعلیق کی ، قدیم دقیانوسی طرز طباعت ”لیتھو“ سے ، گلو خلاصی کرانی پڑے گی بلکہ جلد یا بدیر پرانے لیٹر پریس کو بھی خیر باد کہنا ہوگا ۔ ان دونوں کی بجائے جدید آفسٹ ، لائنو ، مانو اور انٹر ٹائپ کمپوزنگ طباعت کو رواج دینا پڑے گا ۔ نظر برایں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس جدید طرز طباعت میں خط نستعلیق سے کس حد تک کنارہ کشی ممکن ہے اور نستعلیق ٹائپ کی کامیابی کا کہاں تک امکان ہے اور یہ کامیابی ہمیں کتنی مدت میں نصیب ہوگی ؟

نستعلیق کا ماخذ تعلیق ہے، تعلیق کا موجد حسن بن حسین بن علی فارسی ہے جسے اُس نے ۷۰۰ھ (عہد شاہان دیالمہ) میں خط نسخ، رقاع اور ثلث کے لطیف امتزاج سے ایجاد کیا تھا۔ یہ ترچھے حروف میں لکھا جاتا تھا۔ خط نسخ ابن مقلہ کی اختراع ہے جسے اُس نے اپنے ایجاد کردہ خطوط کوفی جدید اور معقلی سے ۳۱۰ھ بہ زمانۂ القاہر باللہ عباسی رائج کیا تھا۔ پھر ۳۸۴ھ میں اسے ابو الحسن علی ہلال (معروف بہ ابن بواب) نے مرصع اور مہذب کیا۔

نستعلیق کا اصل موجد کون تھا؟ یہ اگرچہ ہنوز تحقیق طلب ہے تاہم بعض مورخین اس کا موجد امیر علی تبریزی اور بعض یاقوت مستعصمی کو ٹھیراتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اول الذکر نے خط نستعلیق کی تحریر کے قواعد منضبط کئے اور ۹۰۹ھ میں رسم الخط پر ایک مبسوط رسالہ لکھا جو اس وقت برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ امیر علی نے ۹۵۰ھ میں یا ۹۵۷ھ کے بعد وفات پائی۔ اس لحاظ سے موجودہ خط نستعلیق کی عمر تقریباً ۶۰۰ اور خط نسخ کی ۱۰۶۸ سال ہے اور چونکہ یہ دونوں خطوط ارامی یا سامی الاصل ہیں لہذا کم و بیش ۶ ہزار برس پرانے ہیں۔ نسخ اور نستعلیق کے درمیان جو معمولی سا فرق ہے وہ بھی ذہن نشین کر لیجئے:

نسخ کا ہر دائرہ شروع سے آخر تک یکساں ہوتا ہے اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری پائی جاتی ہے یعنی دائرے گول ہونے کی بجائے اپنا نچلا حصہ چپٹا رکھتے ہیں

جس کی وجہ سے ان میں زاوئیے پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس نستعلیق میں نقاشی اور مصورانہ شان اور بانکپن ہے۔ اس کے حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک ہوتا ہے اور دائرے خوشنما اور مدور ہوتے ہیں تلفظ کی صحت کے لئے اعراب ثلاثہ (زیر، زبر، پیش) اور جزم، تشدید اور تنوین نیز حروف منقوطہ میں امتیازی نقاط جن کو ابن مقلہ نے صحت کے بعد ایجاد کیا تھا نستعلیق کو اور بھی حسین بنا دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نستعلیق اعلیٰ کتابی خط کہلاتا ہے اور نسخ خالص عربی یا قرآنی۔ اس جزوی فرق کے باوجود کاتب اور قاری دونوں کے لئے ان خطوط کا لکھنا اور پڑھنا نہایت سہل اور آسان ہے۔

جہاں تک نستعلیق ٹائپ کا تعلق ہے بلا شبہ نستعلیقی حروف نسخی حروف کی بہ نسبت فنی اعتبار سے ٹائپ کی وضع اختیار کرنے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن ایران، مصر، شام اور عراق نے فنی تقاضوں کے ما تحت نسخ میں اضافہ کرکے اپنا ٹائپ، ٹیلی پرنٹر اور پریس کی تمام ضروریات کو پورا کر لیا ہے۔ ان تمام ممالک میں لائنو ٹائپ اور روٹریاں بکثرت استعمال ہو رہی ہیں۔ دراصل ماضی کی غلامی، حکومتوں کی عدم سرپرستی، اور عوام کی رسمی اصلاحات کے باعث اردو نستعلیق ابھی تک نسخ کی طرح اتنا مکلف اور مہذب نہیں ہوا ہے اسی لئے موجودہ چند دشواریاں ٹائپ وضع کرنے میں پیش آتی ہیں مثلاً :-

(۱) نستعلیق کی خوشنمائی کا دار و مدار نوک پلک اور حروف کی نشست و برخاست پر ہے، یہ باتیں ٹائپ میں پیدا ہونی دشوار ہیں ۔

(۲) نشست کے التزام کے لئے اگر ٹائپ میں ایسے حروف بنائے جائیں جو ایک دوسرے پر چڑھائے جا سکیں تو وہ ذرا سی ٹھیس پا کر ٹوٹ جائیں گے اور بعض مواقع پر بیکار ثابت ہوں گے، نیز کتابت کے اصول سے نشست الفاظ غلط اور بھدی ہوجائے گی ۔

(۳) جلی ٹائپ میں جوڑوں کے لئے جو خط اختیار کیا جائے گا وہ باریک ٹائپ میں غائب ہو جائے گا یعنی ضرورت کے مطابق چھوٹا باریک ٹائپ بننا دشوار ہے ۔

(۴) حروف اور جوڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، کمپوزیٹر کو کمپوز کرتے وقت سخت دشواری کا سامنا ہوتا ہے ۔ نیز کمپوزنگ میں وقت کی تاخیر تجارتی لحاظ سے بھی نقصان دہ ہے ۔

(۵) نقاط، زیر، زبر، پیش، جزم، تشدید اور تنوین کی علامات کو بھی ٹائپ میں لانا ایک ٹیڑھی کھیر ہے ۔

مذکورۂ بالا جن مشکلات کو ہم نے پیش کیا ہے آن پر قابو پانا کس حد تک اور کتنی مدت میں ممکن ہوگا اس کا صحیح جواب تو صرف ماہرین فن ہی دے سکتے ہیں، تاہم گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں آردو ٹائپ کے لئے جو سرکاری اور نیم سرکاری کوششیں کی گئیں ہیں بالخصوص سرکار نظام دکن

نے اردو ٹائپ میں جو اصلاح و ترقی پیش کی ھے اس کو دیکھ کر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ھے کہ اگر اس پر حکومت اور عوام یک جہتی کے ساتھ صحیح معنوں میں متوجہ ہوں تو چار پانچ برس ھی میں موجودہ مشکلات رفع ھوسکتی ھیں اور پھر ھم اپنے اصلاح یافتہ نئے نستعلیق خط کو لائنو ٹائپ اور جدید روٹریوں میں بے دھڑک استعمال کرسکتے ھیں، ھماری صحافت اور جملہ علوم و فنون وھی بلکہ اس سے بھی بلند مقام حاصل کر سکتے ھیں جو اس وقت متمدن ممالک کو حاصل ھے -

یہ تجویز اور خاکہ تو مستقبل کے لئے ھے فی الوقت سوال یہ ھے کہ موجودہ صحافت، علوم و فنون اور نجی و سرکاری مراسلات کی تحریروں میں، جو متمدن دنیا کی ترقی کی آئینہ دار اور قوی نظریات کی نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ھیں، تیزگامی کیونکر پیدا کی جائے اور وہ رتبہ کیسے حاصل کیا جائے جو یورپ اور امریکہ کو حاصل ھے - اس نیک اور عظیم مقصد کے لئے ھمیں تھوڑا سا ماضی قریب کی طرف لوٹنا ھوگا - یقین کیجئے کہ ھماری یہ عارضی پسپائی کوئی رجعت پسندی نہیں ھوگی بلکہ ایک ایسا دانشمندانہ اقدام ھوگا کہ ھم اپنی اس اصل راہ کو پائیں گے جو ھمیں ھماری منزل مقصود پر پہنچانے والی تھی - اس راہ کو ھم نے اول اپنی دوراندیشی سے اختیار کیا تھا لیکن بعد میں مغربیت کے اقتدار سے مرعوب اور محکوم ھو کر اسے چھوڑ بیٹھے - یہ راہ مستقیم وھی شاھراہ خط نسخ ھے جسے

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی کے بعد سر سید اعظم، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم نے اختیار کیا تھا جو فن صحافت اور سیاست کے مسلمہ امام تھے۔ بلا شبہ ان عظیم شخصیتوں نے انتہائی دوراندیشی سے کام لے کر ہمیں ایک روشنی دکھائی تھی۔ سر سید کی سائنٹفک سوسائیٹی کا آرگن، جو بعد میں "علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے مشہور ہوا اسی نسخ ٹائپ میں شائع ہوا تھا۔ سر سید کی تقلید میں مولانا ابوالکلام نے اپنا ہفتہ وار "الہلال" اور بعد میں شائع ہونے والے تمام پرچے اسی نسخ ٹائپ میں شائع کئے تھے، الہلال پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں میں تباہ ہوگیا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے بھی اپنا مشہور اور مقبول اخبار "ہمدرد" نہایت آب و تاب سے اسی نسخ ٹائپ میں نکال کر یہ واضح پیشن گوئی کی تھی کہ اگر اردو ادب اور صحافت کو ترقی کے میدان میں گامزن ہونا ہے تو اس کے لئے صرف یہی ایک راستہ ہے، لیکن کیا کیا جائے یہ ہماری حماقت اور بد اعمالی تھی کہ ہم نے ان آئمہ ملت کی آواز کو لبیک کہنے کی بجائے صدا بہ صحرا کردیا اور اس خط اور لکیر پر نہیں چلے جو ہمیں آسمان شہرت پر لیجانے والی تھی۔ ذرا غور تو کیجئے کہ جس نسخ ٹائپ کو ہم نے ابتدا میں اختیار کیا تھا اگر اسے بدستور اپنائے رکھتے تو آج ایران، مصر، شام و عراق کی طرح ہم بھی ادب، صحافت اور تجارت میں پیش پیش نظر آتے لیکن خیر اب بھی معاملہ اپنے ہاتھ میں ہے۔ اپنی گذشتہ

بربادیوں پر آنسو بہانے کی بجائے ہمیں ہمت و استقلال اور پوری توجه و انہماک کے ساتھ سرگرم عمل ہونا چاہیئے ۔ ہم ہزار سست رفتار اور پس ماندہ سہی لیکن خدا نه کرے که ہم احساس کمتری میں مبتلا ہوں ۔ خدا کا شکر ہے که آج بھی ہمیں بہتوں سے افضلیت و برتری حاصل ہے اور ہمارا ہر قدم اصلاح اور ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے ۔

اردو زبان کے لئے نسخ ٹائپ کوئی نئی چیز نہیں ۔ قدیم اور جدید علوم و فنون کی لاکھوں کتابیں اور اخبارات و رسائل ہمارے مطالعه میں آچکے اور آرہے ہیں ۔ ہماری سب سے عظیم و مقدس کتاب کلام الہی اسی خط نسخ میں ہے جسے ہم حسب توفیق روزانه پڑھتے ہیں، روزانه لکھتے ہیں اور اپنی اپنی جگه کم و بیش بولتے بھی ہیں ۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار ہمارے اس دعوے کا بین ثبوت ہیں ۔ واضح ہو که سندھی . پشتو، بلوچی اور عربی زبان (جنکا رسم الخط عربی نسخ ہے) بولنے والوں کی تعداد ۹۰ لاکھ ۸۹ ہزار ۹۰۰ ہے، ان میں ۴۱ ہزار ۲۱۸ ہمارے مشرقی پاکستان کے بنگالی بھائی ہیں اور ۲۳ ہزار ۸۲۵ مغربی پاکستان کے برادران ہیں ۔ مشرقی پاکستان کے بھائی بنگله زبان اور دیوناگری رسم الخط کے ہزار شیدائی سہی پھر بھی عربی نوشت و خواند کے لحاظ سے اُن کی تعداد مغربی پاکستان سے تقریباً پچاس فیصدی زیادہ ہے ۔ " انجمن حروف القرآن ،، کی مساعی اور مشرقی پاکستان کی اسلام پسندی اس تعداد میں روز افزوں اضافه کررہی ہے ۔ یه اضافه اس بات کی دلیل ہے

کہ مشرقی پاکستان آہستہ آہستہ دیوناگری رسم الخط کو چھوڑ کر اپنے قدیم آبائی سامی خط سے ماخوذ نسخ اور نستعلیق کی جانب بہ رضا و رغبت رجوع ہورہا ہے ۔ بالفرض محال اگر مشرقی پاکستان کے مسلمان اس طرف راغب نہ بھی ہوں تو اُن کے لئے پھر بھی یہ بات قطعاً محال ہے کہ وہ اپنے دیوناگری رسم الخط کو جسے وہاں کی عام اکثریت ایک مدت سے اپنائے ہوئے ہے اور اُس میں اُنھیں ٹائپ اور پریس کی تمام سہولتیں حاصل ہیں، بیٹھے بٹھائے، خواہ مخواہ، رومن رسم الخط کے حق میں دست بردار ہوجائیں اور از سر نو اپنی بنگلہ کی الف، بے، تے رومن رسم الخط میں شروع کریں جو اپنی جگہ صحیح معنوں میں نہ بنگلہ ہوگی اور نہ ہی رومن ۔

اس کے برعکس پنجابی، اردو اور فارسی جن کا رسم الخط اردو نستعلیق ہے بولنے والوں کی تعداد ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ ۱۳ ہزار ۲۲۱ ہے ۔ یہ عربی نسخ کے فدائی اور اردو نستعلیق کے شیدائی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جب ان سے یہ کہا جائے گا کہ تم فی الحال نستعلیق چھوڑ دو اور نسخ ٹائپ کو استعمال کرو تو ان کو نقل کی بجائے اصل شے حاصل کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا اور جب یہ نقل بہ منزلہ اصل ہوجائے گی تو ان کو دوگونہ خوشی و مسرت حاصل ہوگی ۔ باقی رہے عاشقان انگریزی و لاطینی جن کی تعداد صرف ۱۴ لاکھ ہے، یہ انکی دور اندیشی اور پیش بینی ہوگی کہ وہ ہمارے ہمنوا اور ہمشرب ہو جائیں یا اپنی آسی ٹیڑھی لکیر پر چلیں اور گٹ پٹ جاری رکھیں ۔

مختصر یہ کہ خط نسخ سے یہ جو تھوڑی سی اجنبیت اور غیر مانوسیت ہمارا اردو داں اور غیر اردو داں طبقہ محسوس کرتا ہے جب نسخ ٹائپ کا عام رواج ہوجائے گا، تمام کتابیں، اخبارات و رسائل اور سرکاری و نجی مراسلت ایک ہی خط اور ٹائپ میں ہونے لگے گی اور لوگ اپنے نفع و نقصان کو عملی شکل میں دیکھیں گے تو انکی موجودہ غیریت، نا آشنائی، وقتی رقابت اور تعصب جاتا رہے گا۔

واضع رہے کہ اس پیشکش سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے چھ سو برس کے محبوب خط نستعیلق سے عربی نسخ کی خاطر بالکل دست بردار ہوجائیں یقیناً اس میں چند خامیاں ہیں لیکن ان چند خامیوں کے مقابلے میں اس میں حسن و جمال اور دیگر ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جنھیں ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے، اس لئے ایک محدود پیمانے پر صرف اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ اردو نستعیلق اور لیتھو روٹری میں جاری رہے۔ اخبارات کے نام اور ان کے مستقل عنوانات نستعلیق خط کے بلاک بنوا کر نسخ ٹائپ کے ساتھ استعمال ہوتے رہیں، دیگر کثیر الاشاعت چیزیں بھی نسخ ٹائپ ہی میں شائع ہوں، دوسری جانب نستعلیق رسم الخط کو زیادہ سے زیادہ آسان اور کامیاب نستعلیق ٹائپ کی صورت میں لانے کے لئے سرکاری اور عوامی کوششوں کا آغاز کیا جائے تاکہ نشر و اشاعت کے وہ تمام وسائل اور ذرائع ہمیں حاصل ہوجائیں جن سے اس وقت یورپ اور امریکہ متمتع ہورہا ہے اس کام سے عہدہ برا ہوتے ہی ہم

بلا توقف نسخ ٹائپ کی جگہ اپنے اصلاح یافتہ نستعلیق ٹائپ کو رائج کردیں گے۔ اس دوران میں انگریزی کی بجائے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور ابتدائے تعلیم ہی سے نسخ رسم الخط کی مشق کرائی جائے۔ اردو ٹائپ رائٹر اور اردو مختصر نویسی ہمارے لئے اب کوئی نئی چیز نہیں رہی پھر بھی ہائر سکنڈری اسکولوں میں اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کام کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹائپ رائٹر درآمد کئے جائیں۔ ہماری تمام صوبائی حکومتیں اپنے اضلاع میں اردو میں، اور مرکز سے انگریزی میں مراسلت کریں، اس مقصد کے لئے آن ۲۱ ہزار سے زائد دفتری اصطلاحات کو جن کا مستند اردو ترجمہ نیز متعدد ضابطوں کے مجموعے اور سرکاری مراسلت کے نمونے حکومت کی مقرر کردہ مجلس زبان، اردو میں منتقل کر چکی ہے کام میں لائے جائیں۔ صرف مرکز ایک وقت مناسب تک بیرون پاکستان اپنے مخصوص سیاسی مسائل اور تجارتی امور کے لئے بدستور انگریزی میں مراسلت کرتا رہے۔

جہاں تک ہماری اردو نستعلیق کی اصلاحی کوششوں کا تعلق ہے آن میں پہلے سے زیادہ تیزی اور سرگرمی پیدا ہونی چاہیئے، ہمارے سابق وزیر تعلیمات مسٹر فضل الرحمن کے عہد وزارت میں تعلیمی اصلاحات اور رسم الخط اور لغت کے مسئلہ پر غور و خوض ہوا تھا، اس مشاورتی مجلس میں پاکستان کے مشہور خطاط عبدالمجید کو بھی طلب کیا تھا۔ مجید صاحب نے ان مدبروں کی رائے کے

فن خطاطی کی روشنی میں اردو ٹائپ کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا تھا جسے عربی نسخ اور اردو نستعلیق کی ایک درمیانی شکل کہا جاسکتا ہے ۔ ٹائپ کا یہ نمونہ ۴۵۰ ٹکڑوں پر مشتمل ہے ۔ اس وقت یہ نمونہ پسند کیا گیا ، اور اسکی تکمیل کے لئے عملی قدم بھی اٹھایا گیا چنانچہ اس مجوزہ اردو ٹائپ کے خا کے پر لائنو کمپوزنگ مشین تیار ہوئی ۔ یہ مشین اس وقت ہمارے گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں موجود ہے ۔ مجید صاحب کی اطلاع کے مطابق اسی قسم کی دوسری مشین یا مشینیں مشہور سیفی اینڈ کمپنی ، ویسٹ وھارف ، کراچی کے پاس بھی بغرض فروخت موجود ھیں ۔ واضح رہے کہ اس نستعلیق ٹائپ کے مقابلے میں مصری نسخ ٹائپ میں صرف ۲۰۰ جوڑ ھیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ جوڑ جسقدر کم ھوں گے اسی قدر ٹائپ رائٹر اور لائینو ٹائپ کمپوزنگ میں آسانی اور سہولت ھو گی ۔

صرف ٹائپ وضع کرنے کی غرض ھی سے نہیں بلکہ ناخواندہ یا خواندہ طلبا کو اردو پڑھانے اور لکھانے کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے مرکب الفاظ جو کئی حروف پر مشتمل ھوں ان کو توڑ کر ٹکڑوں میں لکھا جائے مثلاً :

صوبجات کی بجائے	صوبہ جات
دستخط کی بجائے	دست خط
فارغ التحصیل کی بجائے	فارغ آل تحصیل

اسی طرح اعراب میں تشدید کو متعلقہ حرف کی مکرر املا یا تکرار سے دور کیا جاسکتا ہے مثلاً:

بطخ کی بجائے بططخ یا بط طخ
کلو کی بجائے کل لو

علامت تنوین کو بھی معمولی سی ترمیم کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں مثلاً:

حکماً کی بجائے حکمن
نسلاً کی بجائے نسلن

خروف شمسی اور قمری کو ٹکڑوں میں لکھ کر اُن کے لام کی آواز کو مخفی اور روشن رکھا جاسکتا ہے کیپٹل لیٹر (حرف کبیر) کے سلسلہ میں بھی اردو پر اعتراض کیا جاتا ہے، جواباً عرض ہے کہ اول تو حرف کبیر کے متعلق ہمارے ہاں یہ قاعدہ موجود ہے کہ خاص نام و مقام لکھنے کے بعد اُس لفظ کے اوپر عرض میں ایک سیدھا خط کھینچ کر اُس کو واضح کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نیا پیرا شروع کرتے وقت اُس سطر کا پہلا لفظ قدرے حاشیہ چھوڑ کر لکھتے ہیں اور اگر فقرہ درمیان ہی میں ختم ہو جاتا ہے تو وہاں نقطہ یا ڈیش (—) دے کر مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں مصر کے سابق شاہ فواد نے ۱۹۳۲ء سے کچھ عرصہ قبل "حروف تاج" کے نام سے "حروف کبیرہ" رائج کئے تھے جو شاید آج بھی وہاں مستعمل ہیں۔ ہم نے اُن حروف کبیرہ کا نمونہ ۱۹۵۴ء میں رسالہ معارف، اعظم گڑھ، میں

دیکھا تھا - ہمارے خیال میں ان حروف میں کافی گنجلک اور طوالت ہے اور ٹائپ کے لئے غیر موزوں ہیں -

اس ترقی یافتہ زمانے میں زبان اور ادب کی نشر و اشاعت کا ذریعہ تنہا ٹائپ اور طباعت ہی نہیں ہے بلکہ ریڈیو، فلم، نیوز سروس (ٹیلی پرنٹر) بری و بحری تار وغیرہ بھی ہیں ٹائپ اور طباعت کے مسئلہ پر تو ہم ابھی کافی روشنی ڈال چکے ہیں - طباعت کا ذریعہ گو مستقل اور دیرپا ہے لیکن یہ اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب طباعت کے تمام مراحل بحسن و خوبی پورے ہو جائیں اور ڈاک کا عملہ بری، بحری اور فضائی مواصلات سے کام لے کر مطبوعہ لٹریچر کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جائے - لیکن ریڈیو بیک وقت ایک ہی لمحہ میں ہماری زبان اور ہمارا پیام دنیا کے گوشے گوشے میں ہر سننے والے متنفس کو روزانہ اور مسلسل پہنچا سکتا ہے - اسی طرح نیوز سروسیں، تار اور ٹیلی پرنٹر کے ذریعہ ایک ملک کی خبریں دوسرے ممالک میں بھیج سکتی ہیں - خاموش اور ناطق فلموں میں حصہ لینے والے اداکاروں کا کردار بھی اس باب میں نہایت موثر اور معنی‌خیز حیثیت رکھتا ہے - پروپیگنڈے کے ان تمام وسائل میں زبان اور رسم الخط کا سوال پوری شدت کے ساتھ موجود ہے -

ریڈیو میں خبروں کا معلن، فیچرز، تقاریر، کہانیوں اور ڈراموں میں حصہ لینے والے اداکار اپنی زبان کو اپنے رسم الخط میں پڑھ کر جس روانی اور صحت کے ساتھ بول سکتے ہیں وہ رومن رسم الخط میں نا ممکن ہے - مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے پروگرام ان کی علمی کم مائیگی کی وجہ سے مسخ ہو جائیں گے -

ان دونوں کے مقابلے میں بچوں کا تعلیمی پروگرام تو قطعاً مفقود ہو جائے گا۔ اس لئے کہ یہ کمسن بچے گھنٹے دو گھنٹے کی روزانہ مشق کرنے کے بعد ساتویں دن کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ریڈیو آرٹسٹ کی نگرانی میں اپنا کردار ادا کریں۔ ادنیٰ و اعلیٰ پرائمری جماعتوں کے یہ ننھے منھے طلبا رومن رسم الخط میں اپنا ریڈیو کا سبق کیونکر پڑھ سکیں گے؟

بھارت اور پاکستان کے ریڈیو کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بھارت اردو کو نظر انداز کرکے ھندی اور سنسکرت کے مغلق اور سنگلاخ الفاظ میں اپنے ملک کی خبریں اور پروگرام پیش کرتا ہے، اس کے برعکس پاکستان ریڈیو کی زبان نہایت آسان اور قابل فہم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں بھارتی ریڈیو کو عوام بہت ہی کم سنتے ہیں اور پاکستان ریڈیو کی آواز بھارت کے طول و عرض میں روزانہ جا بجا گونجتی ہے۔ رومن رسم الخط اس صوتی طلسم کو بالکل پاش پاش کر دے گا۔ فی الحقیقت ریڈیو صرف آواز، زبان، تلفظ اور لب و لہجے کا کھیل ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

نیوز سروس والے اپنے خریدار اخباری اداروں کو ضروری خبریں بھیجنے کے پابند ھیں۔ اخباری عملے کے اکثر ایڈیٹر دن رات ان خبروں کا ترجمہ کرنے اور کاتبوں کو اردو میں لکھ لکھ دینے میں مشغول رہتے ھیں۔ اگر یہی خبریں تار اور ٹیلی کے ذریعہ اردو میں موصول ہوں تو ایڈیٹر ان پر ایک ہی نظر انتخاب ڈال کر کاتب کے حوالہ کر دیا کریں

خبروں کے کالموں میں کافی وسعت پیدا ہوسکتی ہے اور قارئین تک یہ خبریں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پہنچ سکتی ہیں۔ نجی اور کاروباری آردو تار بھی اسی اعتبار سے ترجمہ کی زحمت کے بغیر آسانی سے نشر اور وصول کئے جاسکتے ہیں۔

خاموش فلموں کا دور ختم ہوگیا۔ جس زمانے میں ان کی نمائش ہوتی تھی تو درمیان میں بار بار ڈرامے کی کہانی کا خلاصہ اور اداکاروں کے مکالمے انگریزی زبان میں پردۂ سیمیں پر پیش کئے جاتے تھے لیکن انگریزی داں حضرات انگریزی سے واقف ہوتے ہوئے بھی مقررہ وقفہ میں وہ تمام عبارت نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ناطق فلموں میں بھی فلم کے متعلق ضروری معلومات تحریری صورت میں پیش کی جاتی ہیں، اسٹیج اور فلم کے اداکاروں کو اپنے متعلقہ رول کے مکالمات پڑھ کر ازبر کرنے پڑتے ہیں، ان بڑے بڑے رولز کا حفظ کرنا اصل اداکاری سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اگر رومن رسم الخط جاری کیا گیا تو فلم جیسی نفع بخش صنعت اور پروپیگنڈے کا یہ موثر ذریعہ بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوجائے گا۔

الغرض ہم یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ رومن رسم الخط میں ٹائپ اور طباعت کی بہت سی آسانیاں موجود ہیں اور یہ کہ وہ بہت ترقی یافتہ بھی ہے لیکن ہم اسے اپنانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ سوال صرف آسانیوں ہی کا نہیں بلکہ اس کا مقصد عظیم بھی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔

موجودہ اُردو ٹائپ رومن ٹائپ کے مقابلے میں اتنا ناکارہ نہیں ہے کہ ہم اُسے اختیار نہ کر سکیں ۔ اردو رسم الخط میں اصلاحات کی جاچکی ہیں، اور آئندہ بھی کی جاسکتی ہیں ۔ ایڈیٹر جنگ، کراچی کے بقول رومن رسم الخط اختیار کر لینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جس انگریزی زبان کو ہم اپنے ملک سے جلد یا بدیر ختم کرنا چاہتے ہیں اس کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کے سلسلہ میں سب سے بڑا اور فیصلہ کن قدم اٹھالیا جائے گا اور وہ ان کہی کہہ لی جائے گی جس سے بچنے کے لئے یہ قوم شروع سے کوشاں ہے ۔

حرف آخر

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زبان تو ہے
یقیں پیدا کر اسے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
اقبال رح

مشرق کا مشہور مقولہ ہے کہ نصب العین تک پہنچنے کے لئے تین راستے ہیں۔ تقلید کا راستہ، غور و فکر کی راہ اور عمل و تجربے کی شاہراہ — اس مقولہ کی روشنی میں فیصلہ کیجئے کہ ہمارے لئے کون سی راہ بہتر ہے؟

کورانہ تقلید مسلمان کا شیوہ نہیں، اس کی فطرت میں اجتہاد ہے، غور و فکر کا پتلا ہے اور عمل و ایجاد کا بندہ! وہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ روایات کہن کو ٹھکرائے اور نئی روایات کو قائم کرے۔ اس کے قائم کردہ نقوش دوسروں کے کام آئیں۔ اس کی راہ مستقیم یہی متوازی دوراہہ ہے، — "غور و فکر کی راہ اور عمل و تجربے کی شاہراہ"۔

راہ عبارت ہے، زندگی اور حرکت سے، حرکت میں ہمیشہ برکت ہے۔ راہی یقین محکم اور عمل پیہم رکھتا ہے۔ قدم قدم پر منزل پاتا ہے، منزل بہ منزل بڑھتا ہے اور منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

ہماری حکومت کے تمام محکموں، سماج کے تمام طبقوں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے۔ موجودہ حکومت اس ضرورت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہے، مارشل لاء جاری ہونے کے بعد، ہر محکمے، ہر طبقے، اور ہر شعبے کی چھان بین اور اس میں ترمیم و اصلاح ہو رہی ہے۔ چنانچہ حکومت کا مقرر کردہ تعلیمی کمیشن ہمارے تعلیمی نظام کا مفصل جائزہ لے رہا ہے اس ضمن میں اس کے روبرو مسئلۂ رسم الخط بھی زیر غور ہے۔ اس کی اہمیت اور نوعیت، ارکان کمیشن پر بخوبی روشن ہے کیونکہ قومی ترقی کا انحصار، زبان اور اس کے ذریعہ رسم الخط پر ہے۔ بقول جسٹس کے رحمان، ”کوئی قوم کسی غیر زبان کو اپنا کر اپنی خودی کو قائم نہیں رکھ سکتی، یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ دل کی بات اپنی ہی زبان میں کہی جاسکتی ہے۔ دماغی صلاحیتیں بھی افکار اور تخلیقی فکر سے اسی وقت ہم آہنگ ہوتی ہیں جب ذریعۂ تعلیم اپنی زبان ہو“۔

تعلیمی کمیشن مقرر ہونے کے بعد جب رسم الخط کے بارے میں کمیشن کی جانب سے عوامی نقطۂ نظر طلب کیا گیا تو ملک کے تمام اخبارات نے لیڈنگ آرٹیکلز لکھ کر اپنا اظہار خیال کیا۔ روز نامۂ جنگ، کراچی نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ ایک باقاعدہ استصواب رائے کے ذریعے ملک کی رائے عامہ کو حکومت کے سامنے پیش کیا جو ۔۔۔ سے بھی زائد اردو رسم الخط کے حق میں تھی۔

جنوری ۱۹۵۹ء میں اردو کے ادباء اور شعراء کا ایک عظیم اجتماع کراچی میں ہوا جس کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ اہل قلم کے درمیان یک جہتی اور ہم آہنگی کے جذبے کی تخلیق ہو اور اسلامی نظریۂ حیات اور تعمیر وطن کے باب میں اُن کی مشترکہ اور اجتماعی کوششیں بار آور ہوں - اس کے بعد مارچ ۱۹۵۹ء میں ''مغربی پاکستان اردو کانفرنس'' لاھور میں منعقد ہوئی - اس میں مغربی پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیمی و علمی اداروں کے مندوبین نے شرکت کی - مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ تمام بہی خواہان اُردو نے ایک جگہ جمع ہوکر زبان و ادب سے متعلق تمام مسائل پر غور و فکر کیا - اس کانفرنس میں جو قرار دادیں پاس ہوئی ہیں بلا شبہ وہ نہایت ہی وزنی، ٹھوس اور صحت مندانہ ہیں -

اس باب میں ہم نے بھی اپنی محدود قابلیت اور بساط کے مطابق جو کچھ ہم سے بن پڑا، انتہائی جذبۂ خلوص اور آزادی رائے کے ساتھ بے دھڑک پیش کر دیا ہے - آغاز سے اب تک اردو زبان اور رسم الخط کی یہ داستان غم آپ کے روبرو ہے - ایک فرد قوم ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ ہم بھی اُنھیں قومی نظریات اور مطالبات کے حامی اور علم بردار ہیں جو ''مغربی پاکستان اردو کانفرنس'' لاھور کی قرار دادوں کی صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس مقالے میں مختلف عنوانات کے ما تحت مجموعی طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے کہیں زائد

کانفرنس میں ، با بائے اردو کے علاوہ ، کانفرنس کے صدر استقبالیہ اور فاضل مندوبین نے اپنی تقاریر میں علی الاعلان کہہ دیا ہے، نیز ہمارے قومی معروضے پر پاکستان کے اہل فکر و نظر نے پہلے ہی اپنا صاد کردیا ہے، وہ معروضہ یہ ہے :

(۱) رسم الخط : اردو کے مروجہ رسم الخط "نستعلیق" کو مناسب ترمیم و اصلاح کے بعد برقرار رکھا جائے۔ اصلاح و ترقی کی غرض سے حکومت اپنی اولین فرصت میں ماہرین السنہ ، فن خطاطی اور فن طباعت پر مشتمل ایک سرکاری کمیشن مقرر کرے جس کا دائرہ کار صرف مروجہ خط نستعلیق میں مناسب ترمیم ، تنسیخ اور ایزاد ہو۔ یہ کمیشن ایک وقت معینہ میں اس مسئلۂ رسم الخط پر ہر زاوئیے اور نقطۂ نگاہ سے انتہائی غور و فکر کے بعد حصول مقصد کے لئے اپنی جو مفید اور کار آمد سفارشات پیش کرے اس کا خاکہ ان خطوط پر ہو :

(الف) ہمارے سرکاری اور نجی دفاتر کو اصلاح یافتہ نستعلیقی حروف کے جدید اردو ٹائپ رائٹرز حاصل ہوں۔

(ب) نیوز سروسیں اسی منظور شدہ نستعلیقی حروف کے ٹیلی پرنٹرز میں اخباری اداروں کو تمام خبروں کی تحریر و ترسیل کریں۔

(ج) طباعت کے لئے "لائنو، مانو اور انٹر ٹائپ کمپوزنگ" کی جدید برق رفتار مشینوں میں مجوزہ نستعلیق ٹائپ بلا تکلف استعمال ہو۔

(د) اس عبوری دور میں عارضی طور پر عربی خط نسخ اور ٹائپ کو فی الفور رائج کیا جائے جس میں ٹائپ رائٹرز، ٹیلی پرنٹرز، لائنو، مانو اور انٹر ٹائپ کمپوزنگ طباعت کی تمام سہولتیں اور آسانیاں موجود ہیں ۔ اس وقت ایران ، مصر ، عراق اور شام وغیرہ تمام اسلامی ممالک میں نہایت کامیابی کے ساتھ رائج ہے ۔

پاکستان کی مسلم اکثریت کے لئے بھی یہ کوئی نئی چیز نہیں ۔ دینی مقاصد کے پیش نظر اس سے مزید آشنائی اور قربت انتہائی ضروری ہے ۔

ہمارے قدیم علوم و فنون کا گمشدہ سرمایہ اور جدید علمی و فنی ذخائر کی ایک اچھی خاصی دولت اسی خط کے دامن میں موجود ہے ۔

مغربی پاکستان کی تمام علاقائی زبانیں اس سے ذہنی اور روحانی قربت رکھتی ہیں ۔ مشرقی پاکستان کو بھی عربی رسم الخط سے محبت ہے ۔ اس کے مزید رواج سے ہماری باہمی یگانگت اور اخوت کے احساس کو مزید تقویت پہنچے گی ۔

پاکستان اور ممالک اسلامیہ کے درمیان ایک عالمگیر ہم آہنگی، ہم خیالی اور یک جہتی کی راہیں استوار ہوں گی اور اس طرح ہم ان سے اور زیادہ قریب ہو جائیں گے ۔

(ہ) نسخ ٹائپ کو عارضی طور پر رواج دینے کے لئے تمام مدارس میں، پرائمری سے اعلیٰ جماعتوں تک

فی الفور رائج کیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے جملہ درسی کتابیں نسخ ٹائپ میں شائع کی جائیں تا کہ خواندہ افراد کی اکثریت اور زیر تعلیم طلبا کو اس ٹائپ سے کوئی اجنبیت باقی نہ رہے اور آنے والی نسل اپنا تمام تر کار و بار ٹائپ میں انجام دے سکے ۔

(۲) اتحاد السنۂ پاکستان: علاقائی اور صوبائی زبانوں کا باھمی اختلاط و ارتباط، ملک کی وحدت اور سالمیت کے علاوہ قومی تہذیب اور علمی ترقی کا ضامن اور آئینہ دار ھوتا ھے، لہذا مغربی اور مشرقی پاکستان کے مختلف مراکز میں ھمہ زبان ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جائے ۔ اس ضمن میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جس میں تقابلی ادب کی تحریک کو تراجم اور تالیفات کی صورت میں تقویت دی جائے ۔

(۳) اردو نیوز سروس اور تار: مغربی پاکستان میں اردو اخبارات کی اشاعت انگریزی اخبارات سے کہیں زائد ھے لیکن خبر رسانی کا تمام کام انگریزی میں ھوتا ھے ایسی صورت میں اردو اخبارات کو ترجمے کی زحمت کے علاوہ دیگر متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ھے اور اس وجہ سے اردو صحافت کا معیار بلند نہیں ھوسکتا ۔ دنیا میں ایسے چند ھی آزاد ملک ھوں گے جہاں خبروں کی تحریر و ترسیل کا کام

قومی زبان میں نہ ہوتا ہو لہذا وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر نہ صرف اردو نیوز سروس کا قیام عمل میں لایا جائے بلکہ اردو میں تار دینے کی جو سہولت اس وقت صرف چند شہروں میں ہے اُسے دوسرے شہروں میں بھی عام کیا جائے۔

(۴) تعلیم اور ذریعۂ تعلیم: مغربی پاکستان میں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے:

(الف) اردو کو آرٹس و سائینس کے مضامین کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لئے بلا تاخیر ایک پنج سالہ منصوبہ بنا کر اُس کا نفاذ ۱۹۶۴ء کے تعلیمی سال سے کیا جائے انگریزی کے بعد بھی ایک مناسب مدت تک طب ٹیکنالوجی اور اعلیٰ تر مدارج میں سائینس کی تعلیم کے لئے اردو برقرار رکھی جائے۔

(ب) سائینس اور ریاضی کی تعلیم میں بین الاقوامی مصطلاحات و علامات رائج الوقت کو اردو میں بلا تکلف استعمال کیا جائے۔ اسی طرح بین الاقوامی عددی نظام سے بھی جب تک ضروری ہو برابر کام لیں۔

(ج) مغربی پاکستان میں اردو کی لازمی تعلیم پرائمری سے ہائر سکنڈری تک جاری کی جائے۔ اگر کسی علاقے میں مقامی ضرورت کے پیش نظر پرائمری کے درجے تک مقامی زبان میں تعلیم دینی ضروری ہو تو حتی الوسع اُسے اختیار کیا جائے، جو طلبا ہائر سکنڈری

کے بعد اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند ہوں ان کے لئے انگریزی تعلیم لازمی نہ ہو ۔

(د) درجہ ششم سے ہائر سکنڈری تک عام علمی شوق کے ما تحت انگریزی کی تعلیم کا آغاز بذریعہ اردو نہایت معقول پیمانے پر کیا جائے جو اس وقت نہیں ہے تاکہ طلبا میں نہ صرف انگریزی کی ادبی قابلیت پیدا ہو بلکہ وہ بجا طور پر اس میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکیں ۔

(ہ) مغربی پاکستان کی تمام یونیورسٹیاں فوری طور پر اردو کو ہر درجے میں امتحانی زبان تسلیم کریں اور تمام الحاق کرنے والی جامعات ہر اردو کالج کا الحاق منظور کریں ۔

(و) اردو دارالترجمہ قائم کیا جائے اس کے ما تحت مختلف اداروں میں جملہ علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جائے ۔ اس کے علاوہ اردو میں اصطلاحات کی ایک موزوں فرہنگ ، ایک مبسوط اردو لغت ایک بڑی انگریزی اردو ڈکشنری اور ایک جامع قاموس نیز دیگر ضروری کتب حوالہ کی ترتیب و تدوین کا کام بہت جلد شروع کیا جائے ۔

(ز) اردو کی تمام درسی کتابیں ٹائپ میں چھاپی جائیں ، اس کام کے لئے ضروری مشینری درآمد کی جائے ۔

(ح) اُردو ٹائپ اور اُردو شارٹ ہینڈ کی تعلیم اور سندیں دینے کا تعلیمی اداروں میں سرکاری پیمانے پر انتظام کیا جائے۔

(۵) دفاتر کی زبان: (الف) مغربی پاکستان میں فوری طور پر اُردو کو دفتری زبان کی حیثیت دی جائے اور جب تک مرکز کی زبان انگریزی ہے اُس وقت تک مرکز اور صوبے کے درمیان تمام مراسلت انگریزی میں ہو۔

(ب) ضلعی دفاتر میں اردو کو واحد سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور سکریٹریٹ میں سرکاری نوٹ اردو میں لکھے جائیں۔

(ج) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی اعلیٰ ملازمتوں کے لئے جو امتحانات لئے جائیں اُن میں اُردو کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ تسلیم کیا جائے۔

(د) اردو ٹائپ رائٹرز کی معقول تعداد سرکاری و نجی دفاتر کے لئے مہیا کی جائے۔

(ہ) سرکاری لسانی کمیٹی، جن اصطلاحات، ضابطوں کے مجموعے اور سرکاری مراسلت کے نمونے اردو میں منتقل کر چکی ہے انہیں سرکاری دفاتر میں رائج کیا جائے اور حسب ضرورت اُن میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔

اب قائد اعظم رح اور بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کے الفاظ میں ہمارا یہ حرف آخر بھی سن لیجئے کہ:

" پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی اور جو کوئی اس بارے میں غلط فہمی پھیلانا چاہتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے۔"

(تقریر ڈھاکہ، قائد اعظم رح)

" جو لوگ اپنی قومی زبان کے استعمال سے شرماتے ہیں اُن کو قومی غیریت کا احساس نہیں ہے، وہ قائد اعظم کی توہین کرتے ہیں، وہ اپنے اسلاف کی اور خاص کر اُن بزرگوں کی توہین کرتے ہیں جنھوں نے اپنی مادری، ذہنی، اخلاقی، روحانی مساعی سے اس زبان کو عروج تک پہنچایا، وہ ساری قوم کی توہین کرتے ہیں۔"

(خطبہ صدارت اردو کانفرنس، لاہور۔ ڈاکٹر عبدالحق)

قائد اعظم کی دور اندیشی، سیاسی بصیرت اور اصابت رائے کا کون قائل نہیں؟ بابائے آردو کی ان تھک مساعی اور عظیم الشان خدمات آردو سے کون منحرف ہوسکتا ہے؟ یاد رکھئیے ہم "لشکری" سپاہی ہیں اور آردو ہمارا نا قابل تسخیر قلعہ ہے۔ ہم "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" رکھتے ہیں۔ ہمارے جیتے جی اس قلعہ آردو پر "رومن" دشمن کا پھریرا نہیں لہرا سکتا۔ ہمارا نعرہ ہے ــ

" آردو بولو، آردو لکھو، آردو پڑھو۔"

آُردو زبان زندہ باد

پاکستان پائندہ باد

اشاریہ